

محفل

(20 جولائی 1992ء)

سے سرکار تھا اور نہ کسی یاد سے بس مستقبل ایک ساتھ ہی تھا۔

”ہم یہاں محفوظ ہیں ناں ثروت؟“ دلشاد نے اپنی بڑی سی چادر سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بے یقینی سے ثروت کی سمت دیکھا تھا۔

”ہاں شاید۔“ اور پھر آسمان کی طرف نگاہ کی دور بہت دور کہیں اور سے بارش کے قطرہوں نے نیچے پیاسی دھرتی کی طرف کا سفر شروع کیا تھا۔

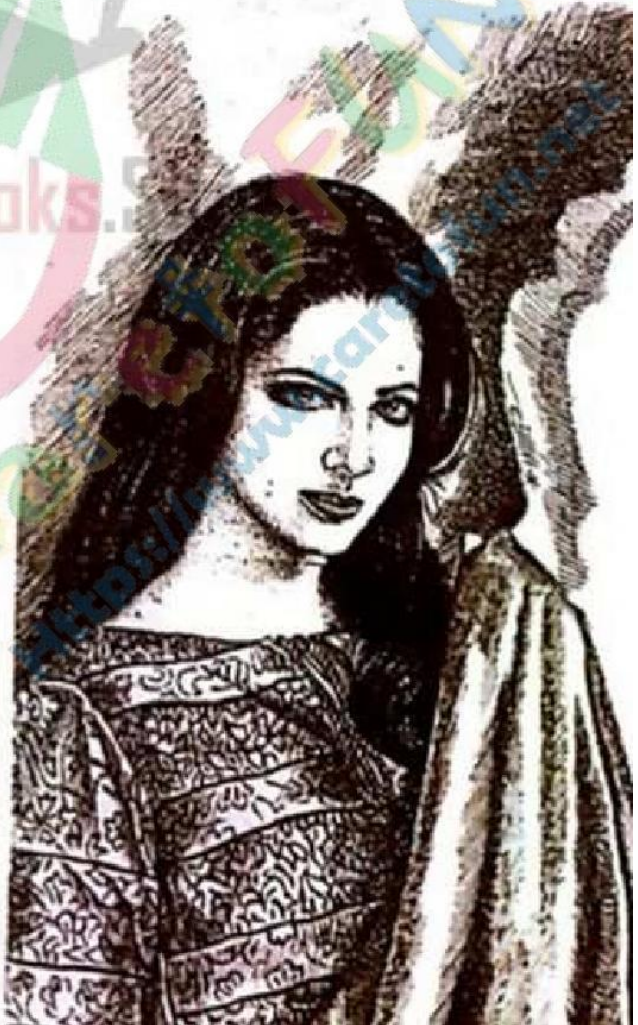
”ثروت یہاں پولیس تو نہیں آئے گی ناں۔“ دلشاد نے ایک غدشہ دل سے نکالنے کی کوشش کی۔

”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا دلشاد کوئی راہ نہیں ہے آگے کتواں ہے اور مجھے کھائی فی الحال بس کچھ دیر کے لیے ہی سہی، کچھ سانس لے لوں کل کر۔“ وہ وہیں بیٹھی پر بیٹھ گئی۔ زرد چہرے اور دھکی ہوئی آنکھوں میں لرزاتے خوف کے سائے لچکے بھر کو معدوم ہوئے تھے، پانی کے قطرے اس کے چہرے سے ٹکرائے اور پھر آنگن کی مٹی مٹی میں جذب ہونے لگے۔

”دس لاکھ روپے دس لاکھ۔“ دلشاد وہیں دروازے سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

”اس وقت مجھے نہ لاکھوں کی پروا تھی نہ جنت دوزخ کی فکر آنکھوں پر بس اپنی بندھی مٹی مٹی کی ریز

دور، دور تک گھٹا ٹوپ اندھیرا، مگر بے پوجہ بادل، کڑکتی بجلی اور آندھی کی صورت چلتی ہوا، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ دونوں عورتیں ایک بوسیدہ سے مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ اندر آتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور بیسے سکون کا سانس لیا تھا۔ دونوں کے لیے یہ چھت اس وقت کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ دونوں کی اپنی ہی ایک کہانی تھی مگر ایک بات تو طے تھی کہ اب نہ ماضی



اسلام علیکم!

ہمیں اپنے Blog Kitabdost

<http://kitabdostpk.blogspot.be>

اور readingpoint

<http://readingpointpk.blogspot.be>

کے لیے لکھاریوں کی ضرورت ہے جو ہمارے لیے ناولز

لکھ سکیں جو خواتین و حضرات شوقین ہیں وہ

ہمیں اپنی تحریر (ناول، ناولٹ، افسانہ قسط وار ناول)

اس میل آئی ڈی پہ سینڈ کر سکتے ہیں

maisrasultan@gmail.com

فیس بک پہ بھی اس میل کے ذریعے رابطہ کریں

”ہاں یاربس دعا کرنا، میری بہن کو کسی کی بددعا نہ ملے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔“ وہ جیسے کہیں کھوسا گیا۔

”بددعا..... اوہ کس نے بددعا دینی ہے لالے، ایویں فالٹو کی فکر میں نہ پالا کر..... ویسے شادی بیاہ کے کاموں پر بڑا پیسہ لگتا ہے، کوئی لاٹری نکلی ہے کیا جو اماں کا آپریشن بھی کروالیا..... رقیہ کی شادی بھی رکھ لی اور وہ اماں بتا رہی تھی کہ تو نے نیا اسکوٹر بھی لیا ہے۔“ امجد نے قہقہہ لگایا اس کی لاٹری والی بات پر اس نے چونک کر امجد کو دیکھا۔

”بس یہی سمجھ لے۔“ وہ پیالہ رکھ کر اٹھ گیا۔
”اوئے کدھر..... ذرا کر تو سیدھی کر لے۔“

امجد نے اسے حیرت سے دیکھا۔
”نہیں یارب..... رب را کھا۔“ وہ صافہ کندھے پر رکھتا دوبارہ ٹرک کی طرف بڑھ گیا دل کا بوجھ ہلکا ہونے کے بجائے مزید بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆
وہ صبح سے غسل خانے کے چکر لگا رہی تھی۔ دلشاد کا وہم یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔
”تو ٹھیک ہے ثروت؟“

”ہاں..... لگتا ہے رات روٹی کچھ زیادہ ہی کھالی..... طبیعت بوجھل سی ہو رہی ہے۔“ وہ ہانپتے ہوئے لفافوں کے آگے بیٹھ گئی اور لٹی بنا کر لفافے بنانے لگی۔

”چھوڑ دے سارے کام ثروت! آرام کر، تجھے آرام کی ضرورت ہے۔“ دلشاد نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

”میری اتنی فکر نہ کر دلشاد، میں ٹھیک ہوں۔“
”تو ٹھیک نہیں ہے ثروت، شام کو ہم سرکاری

ہسپتال جا کر ڈاکٹر کو چیک کروا آئیں گے۔“ دلشاد نے اس سے نظریں چرائی تھیں۔ جو وہم اسے ہوا تھا وہ اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کر سکی۔

”ڈاکٹر کے پاس؟ وہ کیوں؟ کچھ نہیں ہوا مجھے، بس ذرا بد ہضمی ہے، تم کھانا بھی تو اتنا مزے دار بنانی

کی محبت کی پٹی..... مت ماری مٹی تھی میری۔“ وہ آنکھیں موندے چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے بوجھل لہجے سے بولی، جو بادشاہ نے گل ریز کو موٹی سی گالی نکالی۔ وہیں کہیں جیسے کوئی ان دیکھا وجود اس گالی پر کر لایا تھا۔ کسی خیال کے تحت ثروت نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور منہ پر ہاتھ رکھے وہیں اوندھی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

ٹرک سے اتر کر اس نے دودھ پتی کا آرڈر کیا اور شانے سے صاف اٹھا کر ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گیا دماغ شامیں شامیں کر رہا تھا۔ کئی دنوں سے نیند بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔

”کیا ہوا لالے..... آج پریشان لگ رہا ہے؟“
گل ریز نے آنکھیں کھول کر دیکھا، سامنے امجد کھڑا تھا۔ اس کا یار۔

”ہاں یارب..... لگتا ہے دماغ پھٹ جائے گا۔“
”پر ہوا کیا ہے لالے..... کچھ تو بتا؟“ وہ وہیں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”کچھ نہیں یاربس ایسے ہی، بے چینی سی ہے، بوجھ سا ہے دل پر۔“

”اوکھ نہیں یارب..... بڑے دنوں سے حیرتی نیند پوری نہیں ہوئی ناں، اس لیے تو چلتی۔“ امجد نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ وہ زبردستی کی مسکراہٹ بھی چہرے پر نہ سجاسکا۔

”ہوں۔“ اس نے الاپچی کی مہک اڑاتی دودھ پتی کا پیالہ اٹھا کر لیوں سے لگا لیا۔

”اچھا یہ بتا کہ تیری اماں کا آپریشن تو ہو گیا ناں؟“ وہ اس کے پریشان چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں ہو گیا، اب تو اماں کی نظر بھی صحیح ہے بالکل۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”اور وہ بہن رقیہ کی بات بھی پکی کر دی تو نے، کل اماں بتا رہی تھی کہ گل ریز کے گھر سے منہائی آئی ہے۔“ امجد نے بھی پیالہ اٹھا لیا۔

مکمل حنا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

لاہور

نومبر 2018 کا شمار عید نمبر 2 شماریمزگیا ہے

نومبر 2018 کے شمارت کو ایک جھلک

☆ "تو دھڑکن میں دل" ربانہ آلب مکمل ہول

☆ "مجھے آسمان پہ اڑنے دو" مریمہ حیر مکمل ہول

☆ "تم پاس رہو" درشن مکمل ہول

☆ "میں وقصم" بشری سیال کاڈوٹ

☆ "شہر دل کا راستہ" حسین اختر کاڈوٹ

☆ "اک نام تمھارا" راجہ نور کاڈوٹ

☆ "سہاسی، فرحت انصاری، رمشا احمد، حنا منیر

اور حنا بشری کے افسانے،

☆ "دل گزیدہ" ام مریم کاٹلے وارن ہول

☆ "پریت کے اس پار کھیں" نایاب جیلانی

کاٹلے وارن ہول



ہمارے نہیں ٹیبلٹ کی پیاری باتیں، انشلہ نامہ، تمام مستقل

سلسلوں کے علاوہ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

کا شمار آئی آپ قریب

نومبر 2018

کے اشال سے طلب کریں

ہوئیں۔" وہ دوبارہ لفافے بنانے لگی۔
اسی گلی کے برکت حلوائی نے انہیں سموسے،
پکڑے، جلیبی اور مشائی کے لیے الگ الگ سائز کے
لفافے بنانے کا کام دیا تھا۔ یہ بوسیدہ سامکان بھی کسی
نے ترس کھا کر رہنے کے لیے کھول دیا تھا۔
"اللہ کرے کچھ نہ ہو، مگر میں نے کہہ دیا ہے کہ
ہم شام کو چلیں گے تو بہت کمزور ہو گئی ہے۔"
"اف خدایا، میں نے کہا ناں دلشاد کہ میں
بالکل ٹھیک ہوں، تو وہم نہ کر۔" وہ کام میں مصروف
ہوئی۔

"میں وہم نہیں کر رہی ثروت، تو آرام کر میں
تجھے قہوہ بنا کر دیتی ہوں۔" وہ اسے زبردستی اندر
کمرے تک لے گئی۔

"اب شام تک تو نے یہاں سے ہلنا بھی
نہیں۔" وہ اسے سختی سے تاکید کرتی باہر نکل گئی۔ ایک
نئی پریشانی کا سامنا تھا اور اسے ثروت کو سہارا بھی دینا
تھا۔

☆☆☆

(7 ستمبر 1992ء)

"سیلاب کا خطرہ ہے۔ بہت بارشیں ہوتی ہیں،
لگتا ہے یہ مکان خالی کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی ڈیپنس
والی کوٹھی تقریباً تیار ہی ہے، ہم وہاں بھی شفٹ ہو سکتے
ہیں اور یہ شفلنگ کا کام ہمیں آج کل میں ہی کرنا ہو
گا۔" باہر سے عظمت صاحب بڑے گھبرائے ہوئے
اندرا آئے۔

عذرا جوئی وی پر خبریں دیکھ رہی تھیں۔ ان کے
چہرے سے بھی پریشانی عیاں تھی۔

"ہاں میں ملازمہ کو کہہ کر تہ خانے سے سارا
زیور اور باقی ضروری کاغذات وغیرہ نکلوا لیتی ہوں۔"
وہ عجلت میں انھیں۔

"حد کرتی ہو تم بھی طرہ..... ابھی مشکل سے
چار پانچ مہینے ہوئے، بہت بڑا دھوکا کھایا ہے ہم
نے۔ ہماری ہی ناک کے نیچے وہ ہمارے ہی گھر کی

بیٹی، بکریاں کھیل کھیل رہی، ہماری آنکھوں میں دھول
جھوٹ کر بھاگ گئی اور تم ابھی بھی کہہ رہی ہو کہ تم
ملازمہ ہے۔ اتنا اہم کام کرواؤ گی۔ کسی پر بھی اعتبار
کرنے کی ہمت نہیں رہی اب۔“ عقلمند صاحب
خفگی سے بولے۔

”آج رات ہم یہ خانے سے ضروری سامان
نکل لیں گے اور باقی کی شفٹنگ کل تک کر لیں
گے۔“

”وہ ہمارے گھر کی بیٹی نہیں تھی عقلمند..... ہم
نے تو یتیم بچی سمجھ کر ہاتھ رکھا تھا سر پر۔“ عذرا کے
ہاتھ پر ٹیل پڑ گئے عقلمند صاحب مارے شرمندگی
کے کچھ نہ کہہ سکے۔

سوئی۔ بہن کی بیٹی جو ماں باپ کے مرنے کے
بعد ان کے ہاں ہی رہتی تھی، اچانک ہی ایک خط چھوڑ
کر کہیں بھاگ گئی۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ اپنی
خوشی سے جا رہی ہے۔

”آپ نے پولیس میں رپورٹ لکھوانے سے
بھی منع کر دیا۔ بدنامی ہوگی، میری بھانجی کا نام آئے
گا۔“ عذرا یتیم نے خفگی سے کہا۔ وہ جھنجھلا گئے۔

”اچھا اب بس بھی کرو۔۔۔۔۔ بھاگ گئی تو بھاگ گئی
ہمارا کوئی نقصان تو نہیں کیا اس نے۔“
”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ خود پر قابو پاتے وہاں سے
چلے گئے۔ آئندہ ازتالیس گھنٹوں میں سیلاب کا خطرہ
تھا۔ وہ اسی فکر میں ٹیکسٹ کے لیے نکل گئے۔

☆☆☆

بہت بڑی درگاہ تھی۔ یہاں سے وہاں تک لوگ
نی لوگ تھے کہیں لشکر تقسیم ہو رہا تھا، کہیں کوئی منت کا
دھا کا باندھ رہا تھا۔ دوسرے پاؤں تک سیاہ چادر
میں خود کو چھپائے ایک آنکھ سے راستہ دیکھتی آگے ہی
آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ آگے پیچھے چلتے
لوگ اسے مشکوک نظروں سے دیکھیں گے مگر وہاں
کسی کو پر دانتیں تھیں سب اپنی اپنی فکر میں تھے..... دنیا
اور محاسن کے مارے ہوئے لوگ، غم اور دکھ کے
مارے لوگ، سب اپنی اپنی پریشانیاں، اور گھٹیاں

سلجھانے کے چکر میں درگاہ کے احاطے سے آ جا
رہے تھے، وہیں آگے کی طرف بڑھتے ہوئے دریا کی
طرف جاتی سیڑھیوں پر کوئی دکھائی دیا۔ اس کے قدم
رک گئے۔ کوئی نادیدہ طاقت اسے یہاں تک لے کر
آئی تھی۔

وہ کیوں آئی تھی درگاہ؟ اور پھر درگاہ کے
احاطے میں داخل ہو کر مزار پر حاضری دینے کے
بجائے یہاں پچھواڑے میں کیوں آئی؟ سیڑھیوں پر
بیٹھے وجود کو دیکھ کر دل نے ایک عجیب سا کھٹل دیا
تھا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم ان سیڑھیوں کی
طرف بڑھنے لگے۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں بیٹھی
تھی۔ دراز قد، مردانہ ہاتھ جو بالوں سے بھرے تھے
چہرے پر شیو کی نیلاٹھیس، ہونٹوں پر گہری تیز سرخی اور
چادر کی نکل جو کانوں کے پیچھے اڑی گئی تھی۔ ایک
نمے کو اسے دیکھ کر ثروت کی ریڑھ کی ہڈی میں لہری
دوڑ گئی۔ وہ عورت تھی..... یا پھر مرد تھا..... اس نے
گردن گھما کر دیکھا ایک بار، دوبار، پھر تیسری بار
..... ثروت نے سکت و جامد حالت میں بس
سانسوں کا تسلسل جاری محسوس کیا تھا۔

”کیا ہے؟ کوئی کام ہے باجی؟“ اس کی آواز،
اس کا انداز، وہ تو پہچانتھا، وہ اس پہچانے کے سامنے
کیوں کھڑی تھی؟

”کام..... نہیں۔“ وہ چادر کے پلو سے
ہاتھ کا پسینہ صاف کرتی واپس مڑی۔

”بول دے باجی..... کوئی پریشانی ہے کیا؟
ہائے..... تو تو پسینے میں شرابور ہو گئی۔“ وہ اٹھ کر ایک
نی جست میں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”شبنم نام ہے میرا..... سب مجھے شبو کہتے
ہیں۔“ روز ادھر ہی ہوتی ہوں میں، پہلی دفعہ دیکھا
ہے تجھے باجی۔“ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ثروت
نے نظر اٹھا کر دیکھا، وہ کیوں کھڑی تھی اس کے
سامنے؟

”مجھے کام ہے۔“ یہاں اس درگاہ میں لوگ
اولاد کے لیے دعا کرنے آتے ہیں ناں۔“ وہ بے حد

رست آواز میں بولی یوں جیسے حلق میں آواز انک سی گئی ہو۔

”ہاں..... تجھے بھی کروانی ہے؟ پر تجھے کس کے لیے کروانی ہے باجی..... مجھے تو تو دوسرے ہی سے ملتی ہے۔“ اس نے تو نظر بھر کر ثروت کی سمت دیکھا بھی نہیں تھا پھر کیسے پہچان لیا۔

”بچہ لینا ہے۔ منت ماننے آئی ہے پر کس کے لیے باجی۔ یہاں تو بہت آتے ہیں..... وہ جو رکھ (درخت) ہے ناں درگاہ کے باہر..... اگر جھولی میں پتا آ کرے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ مراد پوری ہو جائے گی اور نہ کرے تو اللہ کی رضا سمجھ کر چلے جاتے ہیں۔ پر باجی..... سارے رب کے فیصلے ہیں۔ شبو نے وہ بھی دیکھے جن کی جھولی میں پتا نہیں گرا پر رب سو نہڑے نے اولاد دے دی اور وہ بھی دیکھے جن کی جھولی میں پتا گرا پر خالی جھولی ہی رہی ان کی۔ بتاناں باجی کس کے لیے بچہ لینا ہے۔“

”بچہ لینا نہیں..... دیتا ہے۔“ اس نے دریا کی سمت دیکھا۔ گہرا نیلا پانی سکون سے بہتا جا رہا تھا۔ مغرب کی طرف غروب ہوتے سورج کی نارنجی شعاعیں نیلے پانیوں میں روشنیاں اجاگر کر رہی تھیں۔

”ہاہائے..... باجی..... کوئی اپنا بچہ دیتا ہے کسی کو۔“ وہ سینے پر دو ہتھ مار کر بولی۔

”مذاق نہیں ہے یہ..... تو بس نہیں۔ کچھ نہیں..... میں تجھے کیوں بتا رہی ہوں؟“ وہ واپس مڑ گئی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ درگاہ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

”باجی..... باجی ہائے اللہ..... برا مان گئی باجی! اچھا، آئی ہے ادھر ایک باجی سات سال سے آ رہی ہے بہت اونچے گھر کی ہے تو کہے تو بات کریں؟ تو نے.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔ ثروت کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

”تو نے بچہ دیتا ہے باجی یا پتہ ہے؟“ شبو کے منہ سے نکلے لفظوں نے دل میں جھجکاؤ پیدا کیا۔

”جتنی جلدی ہو سکے تو بات کر لے، میری مجبوری ہے۔ تو بات کر لینا پھر آگے بات کریں گے۔“ وہ اس کی بات کا جواب گول مول کرتی آگے بڑھی تھی۔

”وہ تو کل آئے گی تو میں بات کر لوں گی پر تو کب آئے گی باجی۔“

”جمہرات کو۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی درگاہ کے احاطے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ عذرانے زیور کا ڈبا کھولا تو سارا زیور عائب تھا۔ ”یا خدا۔“ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

”کیا ہوا عذرا بیگم۔“ عظمت جو ضروری کاغذات سنبھال رہے تھے نور اس کی طرف لپکے۔ ”سارا زیور عائب ہے۔ ڈبا بالکل خالی ہے۔“ وہ جیسے بے ہوش ہونے کو تھیں۔

”کیا کہہ رہی ہو.....؟ کہاں جاسکتا ہے؟ جس رات ثروت بھاگی تھی اس رات تو تم نے خود زیور دیکھا تھا، اسی ڈبے میں۔“ انہوں نے یاد دلایا۔ ”ہاں ثروت کے بھاگنے کے بعد میں نے خود دیکھا تھا کہ کہیں وہ کچھ لے کر تو نہیں گئی مگر ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی..... زیور..... یا خدا..... پورے دس لاکھ کے زیور تھے..... دس لاکھ۔“ عذرانے دیوار کو تھاما۔

کوئی اور ملازم..... وہ، وہ دوسری لڑکی..... دلشاد..... دلشاد کب گئی؟“

”دلشاد تو ثروت کے جانے کے بعد پورا ڈیرہ مہینہ کام کرتی رہی۔ وہ تو میں نے خود فارغ کیا اسے نوکری سے جب..... جب پرانی ملازمہ واپس آ گئی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ دلشاد نے ہی یہ کام کیا ہے۔ ہمیں دلشاد کے خلاف رپورٹ لکھوانی ہوگی۔“ عظمت صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”صرف دلشاد نہیں عظمت..... ثروت بھی.....“

اب نکال دیں دل سے بدنامی کا خوف۔ مجھے لگتا ہے کہ دونوں ٹٹی ہوئی تھیں۔ ہونہ ہو یہ ان دونوں کا ہی کام ہے۔ ”وہ رونے لگیں۔

”یہ بات تم اتنے وثوق سے کیے کہ سکتی ہو؟ عفت صاحب کا بھی ماتھا ٹھکا۔

”وثوق سے نہیں۔ شک ہے مجھے اور رپورٹ شک کی بنیاد بری لکھوائی جاتی ہے۔ ثروت نے اگر چوری نہیں مچی گی تب بھی اس نے خانے کے بارے میں ثروت نے ہی دلشاد کو بتایا ہوگا کیونکہ اس کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ خانے کے دروازے کے اوپر یہ جہازی سائز کا بیڈ دھرا ہے اور اس کمرے کی صفائی ستھرائی میں خود یا ثروت ہی کرتی تھی۔ مجھے شک ہے۔“ اور ان کی بات پر عفت نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

سیلاب کا خطرہ تو مٹ گیا تھا مگر اس بجلی مصیبت حال میں انہیں بہت بڑے نقصان کا علم ہوا تھا۔ اور عفت صاحب نے شک کی بنیاد پر دلشاد اور ثروت کے خلاف رپورٹ بھی درج کروادی تھی۔ زیم نے بھی چپ سادہ لی تھی۔ زیم، عذرا اور عفت کا اگلا بیٹا تھا، وہ شروع سے ہی ثروت میں دلچسپی رکھتا تھا، اپنی بیوی پھوپھو اور ان کی بیٹی کو اس نے شروع سے ہی اپنے گھر میں دیکھا تھا پھر ثروت آخوئیں جماعت میں تھی جب پھوپھو کا انتقال ہو گیا۔

”زیم کھانا کھا لو بیٹا۔“ عذرا اس کے قریب ہی کرسی تھیںٹ کر بیٹھ گئیں۔

”تی امی۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کھانا کھانے لگا۔ نی المال تو امی کی ہر بات پکی لگ رہی تھی۔

”دیکھو بیٹا جو ہوا بہت برا ہوا۔ بہت بھاری نقصان ہوا۔ وہ سارا زہر تمہاری دادی کا اور میرا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے لیے رکھا تھا۔ ثروت اگر یہ گل نہ کھلاتی تو شاید بیوی مر ہی جاتی مگر اس طرح۔“

ای کی بات پر پہلی مرتبہ وہ فہم کرنے کے بجائے وہ خاموشی سے انہیں سننا رہا۔

”بابا کہاں ہیں امی۔۔۔؟“

”فیکٹری گئے ہیں بیٹا! سیلاب کے شور شرابے میں بہت پریشان رہے ہیں اوپر سے یہ نقصان۔۔۔ ان کا تو خون ہے ثروت اور جب اپنے ہی دکھ دیں۔۔۔ بیٹھ میں تنہا بیٹھ کر سو کر سو تو دکھ تو ہوتا ہے۔۔۔ خیر۔۔۔ میں تو ابھی بھی شکر ادا کرتی ہوں، وہ میرا سارا زیور لے گئی مگر خدا کا شکر کہ میرا بیٹا میرے پاس ہے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ اپنے ہاتھوں سے زیم کے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے بولیں، وہ بکھرا ہوا تھا۔

”میں نے آپ پر غصہ کیا۔ ثروت کے جانے کے بعد اس کا قصہ آپ پر نکال رہا، آپ سے بدتمیزی کی۔“ وہ سر جھکائے شرمندہ سا تھا۔

”تم میری اولاد ہو۔۔۔ میرے اگلو تے بیٹے تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔ تمہاری خاطر تو میں ثروت کو بہو بنانے کے لیے بھی تیار ہو گئی تھی مگر اس نے کیا کیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی رائے لیتی، منگی یا نکاح کے سلسلے میں کوئی بات کرتی، وہ بھاگ گئی۔“ وہ اپنے ہاتھوں سے نوالے بناتے کر اسے کھلاتی رہیں۔

”کون ہو سکتا ہے وہ؟ جس کے ساتھ وہ بھاگ گئی؟ اس کے ساتھ کیسے رابطے میں ہوگی وہ؟“ زیم کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

”پولیس خود ہی اگلو الے گی سب کچھ۔ اتنے مہینوں سے اس کے بھاگ جانے کے بعد ہم لوگ صرف اس خط کی وجہ سے خاموش تھے جو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھ کر رکھ گئی تھی مگر اب۔۔۔ کوئی سودو سوکا نقصان نہیں ہے، لاکھوں کا نقصان ہے۔“ وہ لہجے کے غصے پر حیران ہوا۔

”پوگیس!“ ان کے ہاتھ سے نوالہ پیچھے کیا۔

”ہاں کل جب ساری بات تمہارے ابو کے علم میں آئی اور خود مجھے سارے زیور کے غائب ہونے کا علم ہوا تو ہم نے رپورٹ لکھوا دی۔“ وہ آہستگی سے

کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔

☆☆☆

یہ..... یہ خط آیا ہے مالی بابا کی بیٹی کا۔ ثروت، تیرے ماموں ممانی نے ہم دونوں کے خلاف پرجا کٹوا دیا ہے۔ پولیس ہمیں ڈھونڈ رہی ہے ثروت۔ دلشاد ہاتھ میں لفافہ لیے باہر آئی۔

”خط..... اسے کیسے پتا چلا یہاں اس کا۔ اس گھر کے پتے پر خط کیسے آیا۔“ وہ چارپائی سے اٹھ گئی۔

”تو اب تم جیل میں چکی پیو گی ثروت..... میں تو تمہارے ہاتھوں پر اپنے نام کی مہندی لگوانا چاہتا تھا..... تمہیں باعزت طریقے سے اسی گھر کی چھت کے نیچے ایک خوش گوار زندگی دینا چاہتا تھا..... تم نے اچھا نہیں کیا ثروت۔“ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

”وہ سبکی تھی ہماری، میں نے مدد کے لیے اسے خط لکھا تھا تو.....“ دلشاد نے سر جھکا لیا۔

”یہ تو ہونا ہی تھا، اسی کے ڈر سے۔“ وہ بے حد آہستگی سے بولی۔

”دس لاکھ..... دس لاکھ روپے..... تو یاگل تو نہیں ہو گئی باجی۔“ شبو کی کا جل بھری آنکھیں پھیل گئیں، ایک ہاتھ سننے پر دھڑکی طرح مارتے ہوئے وہ ثروت کی طرف دیکھنے لگی۔

”اب..... اب کیا ہو گا ثروت.....! خدا غارت کرے اس گل ریز کو۔“ دلشاد کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا، بہت مجبوری ہے۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”میں رقم کا بندوبست تو کر رہی ہوں۔“ میں ان کا زیور تو نہیں لوٹا سکتی مگر میں قیمت چکا سکتی ہوں، اپنا جرم قبول کر کے۔ جب ان کے زیور کی رقم چکا دوں گی تو بری ہو جاؤں گی ہر الزام سے پھر ہم دونوں محنت مزدوری کر کے باقی کی زندگی گزار لیں گے۔ قسمت میں یونہی لکھا ہے، زہیم کا دل دکھانے کی سزا ملی ہے مجھے دلشاد۔“ وہ سنسنے لگی۔

”اور جب تک مجھے مجبوری پتا نہیں چلے گی، میں یہ سودا نہیں کروا سکتی۔“ شبو نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کا دل کٹ سا گیا۔

”ہم دونوں؟“ دلشاد اس کے سامنے آ رکی۔ ”ہم تو تین ہوں گے ناں ثروت اور دس لاکھ آئیں گے کہاں سے ثروت کہیں تو..... ثروت تو نے کسی سے اپنے بچے کا سودا تو نہیں کر لیا؟“ دلشاد کا دل درد سے پھٹنے لگا۔

”سودا نہیں کر رہی میں؟ سچ بھی نہیں رہی اپنا بچہ..... بکاؤ نہیں ہے میری اولاد..... بس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ تو نہیں کر سکتی میرا کام..... اچھا نہ کر۔“ وہ کسل سے بہتے آنسوؤں کو چادر کے کونے سے رگڑتی رہیں پلٹ گئی۔ شبو بچے ہی بھاگی تھی۔

”ہاں بات کی ہے ایک دو جگہ ایک لیڈی ڈاکٹر ہے، اس کے پاس علاج کے لیے ایک امیر گھرانے کی عورت آتی ہے، وہیں بات کی ہے میں نے اور کوئی راستہ نہیں ہے دلشاد۔“ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ آنسو ضبط کیے۔ آنکھوں کے پیالے خشک تھے۔

”تو یاگل تو نہیں ہو گئی ثروت!“ دلشاد اس کے سامنے آ بیٹھی۔

”مجھے پتا تو چلے باجی۔ پھر میں کسی اچھی جگہ بات کروں۔ یہ پاس ہی ایک لیڈی ڈاکٹر ہے وہی نہیں بتاتی ہے خوش خبری والے گھر کا پتا، اسے تو پتا ہو گا کسی امیر گھرانے کی بے اولاد عورت کا۔ تو بتا تو سہی۔ اتنا مجھرو سا کر رہی ہے تو ذرا سا اعتماد بھی کر۔“ شبو نے اس کا ہاتھ تھاما، اسے ایک جھر جھری سی آئی۔ وہ بیچو اس کا ہاتھ تھامے اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔

”تو رہنے دے۔ نہیں دینا مجھے اپنا بچہ کسی کو۔“ وہ بھاگتی ہوئی درگاہ کے احاطے سے نکل گئی تھی۔

”بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے میں نے، اگر یہ نہ کیا تو جانتی ہے کہ کیا ہوگا؟“ وہ لکھ بھر کوری۔
 ”پولیس مجھے زیور چوری کے الزام میں گرفتار کرے گی، کیوں کہ زیور کی ادائیگی میں سر کر بھی نہیں کر سکتی۔ پھر یہ بچہ جیل میں پیدا ہوگا جہاں اس کی ماں چکی دستی اسے گود میں لیے دودھ پلائے گی، جب یہ بڑا ہوگا تو سوچے گا کہ آخر اس کی ماں نے ایسا کون سا جرم کیا تھا، پھر اسے حقیقت کا علم ہوگا تو اسے مجھ سے نفرت ہو جائے گی اور جب سزا پوری ہوگی تو یہ معاشرہ مجھے قبول کرے گا نہ یہ بچہ۔ لیکن یہ جو میں کرنے جا رہی ہوں ناں، یہ اس کے لیے بہت محفوظ مستقبل لے کر آئے گا۔ اس کو ایک بہتر پڑھا لکھا خوش حال گھرانہ مل جائے گا اور میں اس کے بدلے ملنے والی رقم سے نہ صرف پولیس جیل کے چکر سے آزاد ہو جاؤں گی۔ ہاں..... ماں ہوں۔ ایسا کرتے ہوئے جان جا رہی ہے پر جو جان آرہی ہے اس کو عزت والی زندگی دینے کے لیے یہ روز مرنے کی اذیت منظور ہے مجھے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ ٹھنڈی آہ بھر کر آسمان کی سمت دیکھنے لگی۔

”مگر رقم بہت بڑی ہے ثروت..... کون دے گا؟“

”اولاد کی کمی بھی بہت بڑی ہے دلشاد..... ایک عورت اپنا ادھر اپنا مکمل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی رقم ادا کر سکتی ہے۔ اپنا زیور بیچ کر بھی اولاد کا زیور لینا گھانٹے کا سودا نہیں۔“ وہ بے حد مطمئن تھی۔
 مغرب کی طرف سورج غروب ہو رہا تھا۔ دلشاد ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگی۔ دل جیسے اسی سورج کی طرح ڈوب رہا تھا۔ دونوں ساکن نظروں اور گہری خاموشی سے سورج کو دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

”میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں امی۔“
 زمیم ان کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی دعا کر رہی تھیں۔ مسکرا کر اسے دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا لیا۔

”آؤ بیٹھو.....“

”یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں تھی، آپ نے ہمیشہ ثروت کو بہو بنانے کے لیے مجھے حریص سوچنے کا کہا۔ آپ نے ہمیشہ مجھے سمجھایا کہ وہ بہت گہری لڑکی ہے اور میں نے ہمیشہ آپ کی ٹی ٹی کی۔ اس نے دھوکا دیا۔ آپ کا زیور لے کر بھاگ گئی، نمک حرامی کی ہے اس نے، میں اسے پہچان نہیں سکا۔ اگر اسے زیور ہی چاہیے تھا تو وہ تو اسے دیے بھی مل ہی جاتا تھا مجھ سے شادی کر کے بلکہ صرف زیور ہی کیا، یہ گھر..... یہ گاڑی، مگر نہیں آپ بالکل سچ کہتی تھیں وہ بہت گہری لڑکی تھی۔ اسے عزت راس ہی نہیں آئی اور پتا نہیں امی..... وہ کون ہوگا جس کے ساتھ وہ بھاگی ہوگی، میں سوچتا ہوں تو دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ آپ بس جلدی کریں، اسے سزا ملنی ہی چاہیے۔“ وہ بات مکمل کر کے اٹھ گیا۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھالیے۔

☆☆☆

گہرے سیاہ گھٹنگھور بادل گرج گرج کر اپنا آپ دکھا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر گہرا اندھیرا چھا گیا۔ یوں جیسے رات ہو گئی ہو۔ گہری سیاہ گھٹاؤں کے نیچے دریا کا پانی بھی سرمئی رنگ کا ہو رہا تھا۔ دریا کی طرف اترتی سیڑھیوں پر بیٹھی وہ آنسو بہا رہی تھی۔ گھر جانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے کسی ڈاکٹر سے فی الحال کوئی بات نہیں کی تھی، خود کو اور دلشاد کو تسلی دی تھی۔ امید تھی کہ خدا کوئی سبیل نکالے گا، رقم کے بندوبست کا بس یہی ایک راستہ تھا۔ بجلی بڑے زور سے چمکی تھی۔ آسمان سے پانی برسنے کو تیار تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے ٹل پر دریا کا پانی ٹھوڑھٹا تھا۔

”ہائے باجی..... تو ادھر بیٹھی ہے میں تجھے ساری درگاہ میں ڈھونڈ رہی تھی۔ ہو گیا بندوبست پورے دس لاکھ کا۔“ وہ اس کے برابر آ بیٹھی۔

”ہیں.....؟“ اس نے بے یقینی سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو کے لال سرخی لگے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

”ہاں..... عیش کرے گا تیرا بچہ..... وہ باجی

پورے دس لاکھ دینے کو تیار ہے پر اس کی ایک شرط ہے۔ "شیبو نے ہاتھ کا چھبنا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ برآمدوں کا ایک غول جا رہا تھا۔

"کیسی شرط؟" وہ سیدھی ہوئی تھی۔

"حیران کوئی حق نہیں رہے گا پھر۔" شیبو نے سر جھکا لیا۔

"ہاں جانتی ہوں۔" اتنی بڑی رقم ہے، کوئی اتنی بڑے رقم دے کر حق تو اپنے نام کرے گا ناں۔

"کب دے گی پیسے؟" وہ آنسو صاف کرنے لگی۔

"جب بچہ اسے ملے گا۔ تب ہی دے گی ناں۔ اگر رقم پہلے دے دے اور بچہ نہ رہے تو وہ ہنوز سر جھکائے بول رہی تھی۔

"اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ تب تک تو پولیس آ

پہنچے گی؟" وہ خود کھامی کے انداز میں بولی تھی۔

"پولیس؟" شیبو نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"ہاں میرے پیچھے پولیس پڑی ہے۔ میں نے

چوری کی ہے تقریباً نو دس لاکھ کا زور اپنے ماما کی

گھر سے چوری کر کے بھاگی تھی۔" اس نے اعتراف کیا۔ شیبو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"تو۔۔۔۔۔ تو اس مقدمے سے بچنے کے لیے اپنا

بچہ بیچ رہی ہے۔ تو اپنی اولاد کو، کسی الٹا دیکھی انجان

عورت کے حوالے کر رہی ہے، زبوری کی رقم بھرنے کے

لیے۔ باجی تھی ظالم ہے تو؟" شیبو نے دہائی دی۔

بارش شروع ہوئی۔ آسمان بھی اس کے دکھ پر

کھل کر رونے لگا تھا۔ وہ مزار میں جا کھڑی ہوئی۔ شیبو

بھی اس کے پیچھے آ گئی۔

"میں اب تجھ سے کچھ نہیں پوچھوں گی باجی۔

کوشش کروں گی کہ تجھے رقم پہلے ہی مل جائے۔ یہ بچہ

جیل کے ہسپتال میں پیدا نہ ہو۔" وہ اس کے سر پر

ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"چوری کی۔" زیمیم کا اپنے ماموں کے بیٹے کا

دل توڑا، ایک انجان شخص کی باتوں میں آ کر۔ اس

کے ساتھ بھاگنے اور شادی کر کے گھر سامنے کا خواب

دیکھا۔ زیمیم بد صورت اور وہ خوب صورت گلنے لگا۔

بڑی بے عقلی عمر ہوتی ہے، منہ کے بل گراتی ہے۔ وہ

سارا زور ہتھاکر بھاگ گیا۔۔۔۔۔ اور اس ساری سازش

میں، میں اس کی نہیں تھی۔ میری سہیلی دلشاد بھی شامل

تھی۔ اب ہم دونوں عورتوں کی زندگی اور عزت اس

بچے کے سودے سے جڑی ہے۔" اس کے سر پر دھرا

شیبو کا ہاتھ لٹکے بھر کو لڑا تھا۔

"شیبو تجھے منہ کے بل گرنے نہیں دے گی

باجی۔" وہ سسکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ودھائی ہو ودھائی۔۔۔۔۔ پورا ہزار کا نوٹ لوں

گی کا کے کا۔" وہ زور زور سے تالی بجاتی درگاہ میں آئی

کسی عورت کی طرف بڑھی تھی۔ عورت نے گود میں

بچہ اٹھا رکھا تھا۔ ساتھ کھڑے اس کے شوہر نے بیوی

بچے پر چھتری تان رکھی تھی۔ ثروت نے اس منظر کو

بڑی حسرت سے دیکھا۔

"ہاں ہاں ہزار ہی دوں گی تو گھر آنا شیبو۔۔۔۔۔

سونے کی بالیاں بھی دوں گی۔" وہ عورت خوشی سے

بولتی آگے بڑھ گئی۔ شیبو نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"لوگوں کی گود بھرنے کی دعا کرتی ہوں باجی،

تیری گود سونی کرنے کی دعا کیسے کروں۔" وہ اشک

بار آنکھوں کو اس سے چھپاتی درگاہ کے احاطے سے

باہر نکلی۔ چھابو چھان بستی بارش میں اس کا رخ

اپنے ٹھکانے کی طرف تھا۔۔۔۔۔ اسے گرد سے ملنا تھا۔

☆☆☆

(3 مارچ 2018ء)

بہار کا موسم تھا۔ ہر طرف رنگ رنگ پھول

کھلے تھے۔ لندن کی بے بس فضاؤں کو خیر باد کہہ کر

اپنے وطن کی ہوا میں سانس لیتے ہی ایک طمانیت سی

دل میں اتر گئی تھی۔ اس نے موبائل پر ماں کو اپنی آمد

کی اطلاع دی تھی مگر جانتا تھا کہ ماں نہیں آئے گی۔

ماں کو اس سے بھی زیادہ اپنے اللہ سے پیار تھا۔ وہ

بہت باپردہ اور عبادت گزار تھی۔ اور اسے یقین تھا کہ

اس وقت بھی وہ جائے نماز پر بیٹھی اس کے خیر و عافیت

سے وطن پہنچنے کے لیے دعا گو ہوگی۔

ارمان علی، اپنی بڑھائی مکمل کر کے واپس لوٹا تھا۔ عجیب سی سرشاری تھی، دراز قد، گہری بھوری آنکھیں، کھلتی ہوئی رنگت صحت مند کسرتی جسم۔ وہ اندر باہر سے ایک مکمل انسان تھا، مطمئن زندگی سے بھرپور مادر یہ سب اللہ کے بعد ماں کی وجہ سے تھا۔ ماں، جو اس کی کل کائنات تھی۔ اسی سرشاری اور خوشی میں اس نے ہاتھ کے اشارے سے کیب روکی۔

☆☆☆

(12 نومبر 1992ء)

فساد میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔ وہ بڑی سی چادر اوڑھے درگاہ کے عقبی صحن میں آئی جہاں میٹریاں دریا کی طرف اترتی تھیں۔ شبو وہیں بیٹھی تھی۔
”آگئی تو باجی۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ رات پولیس نے چھاپہ مارا محلے میں۔۔۔۔۔ کسی نے برکت حلوائی اور ہمارے بارے میں بتا دیا۔ وہ تو بھلا ہو برکت کی بیوی کا جسے میری حالت پر ترس آ گیا اور وہ مجھے اور دلشاد کو لے کر نکل گئی مگر ہم ہر بار نہیں بچ سکتے شبو۔۔۔۔۔ رات تو برکت چاچا بھی بچ گیا مگر پولیس پھر آنے کا کہہ کر گئی ہے اور اب تو برکت چاچا جانے بھی نہیں یہاں سے چلے جانے کا کہا ہے۔“ وہ اس خنک موسم میں بھی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔
”ہاں۔۔۔۔۔ فکر کے دن گئے باجی۔۔۔۔۔ یہ لے تیرے پورے دس لاکھ۔“ شبو نے ایک تھیلی اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس کے کھر دے ہاتھ لٹکے بھر کو ثروت کے ہاتھوں سے مس ہوئے، وہی گمن محسوس ہوئی تھی جو پہلے دن محسوس ہوئی تھی مگر وہ اس تھیلی کو دیکھنے لگی جو ان ہاتھوں میں دبی تھی۔
”یہ۔۔۔۔۔ مگر وہ عورت۔“

”بات یہ ہے باجی کہ وہ عورت اپنی ساس سر سے دور یہاں اس شہر میں رہ رہی ہے۔۔۔۔۔ بانجھ ہے مگر ساس سر کے سامنے دونوں میاں بیوی یہی ظاہر کریں گے کہ بچان کے ہاں پیدا ہوا ہے تو سمجھ رہی ہے ناں باجی۔۔۔۔۔ اس نے ڈاکٹری سے بات بھی کر لی

ہے ادھر وہ ایک دن رات ہسپتال میں ساس کے آنے تک رہے گی، تب تک بچہ تیری کوکھ سے اس کی گود تک منتقل ہو چکا ہوگا۔۔۔۔۔ تجھے تیرے پیسے سے مطلب ہے۔۔۔۔۔ لے پکڑ۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے مانی ہے وہ۔“ شبو نے رازداری کے انداز میں کہا۔

”مگر شبو ایک بار میں اس عورت سے مل تو لوں کون ہے، کیسی ہے؟ میرا بچہ جس کی گود میں جائے گا، جسے ماں بلائے گا، جس کے آگن میں چلنا سکھے گا۔ میں اسے کچھ تو جان لوں۔“ اس کی بات پر شبو کی آنکھوں میں انگارے بھرے تھے۔

”دس لاکھ ہے باجی۔۔۔۔۔ دس روپے نہیں ہیں۔ کھاتے پیتے گھرانے کی ہے اور اچھا پیار محبت والا گھرانہ ہے تب ہی تو اس کا شوہر اس سارے کھیل میں اس کا ساتھ دے رہا ہے ورنہ چھوڑ دیتا اور کر لیتا اولاد کے لیے دوسری اور باجی، وہ عورت جو بھی ہے چور نہیں ہے اور باعزت طریقے سے بیاہ کر آئی ہے شوہر کے ساتھ۔۔۔۔۔ کسی ایرے غیرے کے ساتھ بھاگی نہیں ہے۔“ شبو کا یہ سخت لہجہ ثروت کو بہت کچھ باور کرا دیا گیا۔ یعنی وہ عورت جو اس کا بچہ لینے کو تیار ہوئی تھی، اتنے معزز اور عبادت گزار گھرانے کی تھی کہ اس جیسی گھٹیا عورت سے ملنا بھی اسے پسند نہیں تھا۔
”تو صاف کہہ دیجیے شبو کہ وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔“ ثروت نے تھیلی پکڑ لی۔
”گن لینا پورے دس لاکھ ہیں۔“

”اور تیرا حصہ شبو۔۔۔۔۔!“ وہ جیسے ہوش میں آئی تھی۔

”میں تو اس سے لوں گی جس کی گود تو پھرنے جا رہی ہے باجی۔“ شبو عجیب انداز میں مسکرائی تھی۔

”اور لکھت بڑھت کا کام۔۔۔۔۔ مطلب میرا بچے پر کوئی حق نہیں ہوگا وہ!“ وہ لرز رہی تھی۔

”زبان بڑی چیز ہوتی ہے باجی۔۔۔۔۔ نئی صدی آنے والی ہے ابھی آئی نہیں۔ ابھی خون بھی سفید نہیں ہوئے اور زبان کا پاس بھی ہے۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ جب بچہ پیدا ہوگا تو تجھے بس ایک کاغذ پر دستخط کرنے

ہوں کے بہائی تیرا مسئلہ تو حل ہو گیا۔“ شبو مسکرانے لگی۔

”میں تیرا شکر یہ کیسے ادا کروں شبو اتو تو فرشتہ ہے۔“ وہ سکتے لگی۔

”نہ باجی..... دونہ..... شبو تو پوری انسان بھی نہیں ہے..... مجھے فرشتہ نہ بنا..... بس شاید تیرا راستہ مجھ تک تھا یا پھر میں تیرے راستے میں کھڑی مگی رب نے سبیل بنادی..... ہابائے باجی..... اب بس کروے خدا نے تیرے سر سے بوجھ اتارا ہے..... بس چپ کر جا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئی۔ ثروت سر جھکائے سکتی رہی۔

☆☆☆

(3 مارچ 1992ء)

سرکاری ہسپتال کے اطراف میں پھول سی پھول کھلے تھے۔ ایک پھول اس کی زندگی میں بھی کھلا تھا۔ گولی منول سا پیار سا بچہ..... اس نے بس ایک جھٹک دیکھی تھی اس کی ڈاکٹر اور شبو لے گئے اسے، لڑتے ہاتھوں سے ایک کانڈ پر ثروت نے اپنا نام کھینچا تھا۔

”نی امان اللہ۔“ ایک الوداعی نظر اس دروازے کی سمت دیکھا جس سے ابھی کچھ دیر پہلے وہ اس کے جگر گوشے کو لے گئی تھی۔ لٹا داس کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

☆☆☆

”زمیم بیٹا مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی۔“ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا جب ای کی آواز آئی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھ رہی تھیں۔

”مٹی ای کیسے؟“ وہ منہ سے تو کچھ نہیں بولیں کہ کیا تے ہاتھوں سے انہوں نے ایک لفافہ اور رسید زمیم کی سمت بڑھادی۔ اس نے تعجب سے پہلے ان کے خالی چہرے کو دیکھا اور پھر وہ لفافہ تمام لیا۔ ڈاک کی خاص سروں کے ذریعے لفافہ اور وہ رسید.....؟

”آپ ہی بتا دیں یہ کیا ہے۔“ وہ ابھی بھی

حیران تھا بیچے والے کے نام پر جیسے فخری غمہ نہیں۔ ”اوہ۔“ بے تابی سے لفافہ کھولا جس میں رقم کے ساتھ کانڈ کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔

”زیور تو نہیں بھیج سکتی مگر نقصان بھر رہی ہوں۔“

”تو ثروت نے اپنے ماتھے سے چوڑی کا داغ دھو دیا۔“ وہ بجلی آنکھوں پر ہر ضبط سے بند باندھ رہا تھا۔

”ہاں..... کل صبح میں اور تمہارے ابو جا کر ثروت کے خلاف رپورٹ داپس لے لیں گے۔ ابھی تو شکر ہے کہ خاموشی سے معاملہ حل ہو گیا ورنہ اگر زیور کا نقصان نہ بھر پانی..... پولیس کے ہاتھ تو لگ ہی جاتی ایک نہ ایک دن..... تو زندگی کے کتنے ہی سال خیل میں گزارتی..... حق باہ..... کیا کر دیا اس لڑکی نے..... مجھے تو لگتا ہے کہ جس کے ساتھ بھاگی تھی وہ بھی چھوڑ گیا ورنہ آج صبح وہ خود آتے..... عذرا چائے بنانے کی نیت سے اٹھ گئیں۔

”اگر اس نے رقم دل بس ہی کرنی تھی..... سارا نقصان بھرنا ہی تھا تو وہ زیور لے کر بھاگی ہی کیوں.....؟ کیا تھا اس کے دماغ میں.....؟؟ اور اتنی بڑی رقم اگر وہی زیور بیچ کر بھری ہے تو زندگی کیسے کانٹے کی وہ؟؟ کیا کرے کی؟ کون ہے اس کے ساتھ؟“ زمیم کا دماغ پھر الجھنے لگا۔

”شکر خدا کہ میرے زیور کا نقصان بھر دیا اس نے اصلی سونا تھا..... خالص سونا..... حق باہ..... اب نئے ڈیزائن کا بنواؤں گی سارا..... بس اب جلدی سے لڑکی ڈھونڈ کر تیرے فرض سے بھی قاریغ ہو جاؤں۔“ عذرا وہیں بہن سے بول رہی تھیں زمیم اب ماں کی کسی بات سے انکار کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

(3 مارچ 2018ء)

خوب صورت سادہ اور پرسکون مکان..... اندر قدم رکھتے ہی پتی برتھ ڈے ٹوپ کا گیت بجنے لگا تھا۔

ارمان نے بیک واپس پھیکا اور ماں کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔

”آپ اسی لیے نہیں آئی ناں مجھے لینے.....“
”میں کیاں جاتی ہوں اور بھلا..... ماں مجھے ساگرہ بھی یاد بھی اور اپنے بیٹے کو سر پر اتر بھی دینا تھا۔“ ماں نے ماتھا چوما۔

”اور مجھے پتا تھا کہ آج یہاں میرے لیے بہت بڑا سر پر اتر ہوگا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ سامنے رکھا کیک، گفٹ اور پھول ماں کی محبت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

”چلو آ جاؤ..... اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو۔ ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ.....“

”میں شاور لے کر ابھی آیا۔“ وہ محبت بھری نظر سے ماں کو دیکھتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆
گھر رگھر کرتی سلائی مشین سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ نظریں ٹپک اٹار کر ساڈ پر رھی اور دلشاد کے ہاتھ سے چائے کی پیالی تھام لی۔

”میں شام کو بازار جاؤں گی ثروت.....“
باورچی خانے کا سارا سامان ختم ہے وہی لینے، تین مینے کا کرایہ بھی جمع کروا دیا ہے میں نے کیس بجلی کا بل بھی جمع ہو گیا تو ساتھ چلنا کل سچ اپنی نظر چیک کروا لینا۔“ دلشاد نے کرسی پر بیٹھ کر چائے کی چسکی لی۔

”ہاں کل صبح جاؤں گی۔ نظر بہت کمزور ہو گئی۔ اب تو سوئی میں دھاگا بھی نہیں ڈالا جاتا۔ بوتیک والی آپا جان کہہ رہی تھیں کہ تمہارے کام کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے اور میں ہنسنے لگی کہ کیا بتاؤں نظر اور ہمت کھٹکتی جا رہی ہے۔“ اس نے بھی چائے کی پیالی اٹھالی۔

”ہاں بھئی، نظریں کمزوری میں تمہارا اپنا ہاتھ ہے، ساری رات رو کر گزارتی ہو تم..... بچپس سال ہونے کو آئے مگر تمہارے آنسو خشک نہ ہوئے۔“ دلشاد نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ دکھ آج بھی اسی طرح تازہ ہے

دلشاد..... وہ ایک جھٹک آج بھی نظروں میں محفوظ ہے، تو نہیں سمجھے گی۔“ وہ عجیب انداز میں مسکراتی تھی۔

”آج ساگرہ ہے اس کی۔ رات کو آتے ہوئے کیک لے آؤں گی، چل اب خوش ہو جا شاہاش۔“ دلشاد کے کہنے پر وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں یہ لے، کیک اچھا سا لے کر آنا۔“ اس نے چادر کے پلو سے پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

”رکھ پاس، میرا بھی کچھ لگتا ہے۔ ماسی ہوں میں اس کی۔ اس کے باپ کی باتوں میں آ کر ہم دونوں بھاگی تھیں۔ دھوکا ہم دونوں کے ساتھ ہوا تھا۔ ہاں تیرا نقصان مجھ سے کئی زیادہ ہے۔ تیرا دل اور گود دونوں خالی ہو گئے اور میرے صرف خواب۔“ دلشاد چائے پینے لگی ثروت کرسی کی پشت سے سر نکائے دور بہت پیچھے کا سفر کرنے لگی۔

☆☆☆
”ثروت..... ثروت کہاں مر گئی کم بخت!“
عذرا مہمانی کی آواز پر وہ سوئی دھاگا اور فریم رکھ کر باہر بھاگی تھی۔

”جی مہمانی؟“ کسی ہاتھ باندھے غلام کی طرح وہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”شام ہونے کو آئی ہے۔ آنا گوندھنا ہے، کچھ ہوش ہے تمہیں اور مٹھے میں سویاں بنا لینا۔ زعیم کو بہت پسند ہیں، کالج سے تھکا ہارا آئے گا۔“ وہ خطکی سے بول رہی تھیں۔

زعیم ان کا اگلوٹا بیٹا تھا۔ کالج سے واپسی پر اکیڈمی جاتا تھا اور اس کی واپسی تک چار بج جاتے تھے، ایسے میں اسے آتے ہی کھانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ زعیم ایک اچھا سلجھا ہوا بڑھا کوڑکا تھا لیکن اس کا رنگ سیاہ کالا تھا۔ اس پر نظریں ٹپک بھی لگی تھی۔ ثروت کو بھی وہ کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ زعیم کے کوئی خاص دوست بھی نہ تھے۔ ماموں کا خیال تھا کہ پڑھائی مکمل کر کے وہ ان کے ساتھ فیکٹری سنبھالے

بن کر دینا اور مفلح بھی۔“ زعمیم اپنی طرف سے دوستانہ انداز میں بولا تھا۔ اس نے چکر منہ پھیر لیا۔ اس کے سیاہ چہرے پر روشن سفید آنکھیں اور اس کے سفید دانت بہت عجیب سے لگتے تھے۔
”ہوں..... ٹھیک ہے کرلو شوق پورا۔“ غدار ہار مان گئیں۔

☆☆☆

دشاد سلائی اسکول میں آتی تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ خالہ کے ساتھ رہتی تھی۔ خالہ اس کی شادی اپنے خشیات کے عادی بیٹے سے کرنا چاہتی تھی۔ ثروت کو اس کی کہانی اپنے جیسی لگی۔ دونوں کی خوب دوستی ہو گئی۔ اسی اسکول کے باہر گل ریز وین میں لڑکیوں کو چھوڑنے آتا تھا۔ اس کی نظریں گل ریز کا تعاقب کرنے لگیں۔ اپنے نین نقوش سے وہ پٹھان لگتا تھا۔ وہ بھی ثروت کی نظروں کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ سلام دعا سے بات شروع ہوئی اور سوئیاں دھاگے ٹنکیاں منگوانے سے ہوتے ہوتے اس بچ پر پہنچ گئی کہ ثروت کے لیے اب ساری کائنات ہی گل ریز تھا۔ گل ریز اس کے سارے حالات سے واقف تھا۔ وہ اس کو سبز باغ دکھانے لگا۔ اپنے باوے میں بس یہی بتایا کہ اس کا تعلق صوبہ سرحد کے کسی گاؤں سے ہے اور وہ کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہے۔ ثروت خیالوں ہی خیالوں میں زعمیم اور گل ریز کا مقابلہ کرتی..... اور پھر اسے اپنی اور گل ریز کی جوڑی دنیا کی سب سے خوب صورت اور مکمل جوڑی لگتی۔

”یعنی تیرے ماموں، مامی تیرے حق پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں..... وہ زیور جو تیری ممانی نے اتنے بڑے صندوق میں بند کر رکھا ہے صرف اس کا تو نہیں، تیرا بھی ہے، تیری نانی کے زیور پر تیرا بھی تو حق ہے۔ سیدھے طریقے سے نہیں دیتے تو اپنا حق چھین لے۔“ گل ریز نے وین کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے مشورہ دیا۔ ثروت کے ساتھ ساتھ دشاد نے بھی دیکھا، وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔
”مطلب؟“

ما۔ زعمیم اسے خاص نظر سے دیکھتا تھا۔ خود ماموں کا خیال تھا کہ زعمیم بھی عام شکل و صورت کا مالک ہے۔ اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنا مشکل ہو گا۔ ثروت گھر کی لڑکی ہے۔ زعمیم بھانجی ہے..... اسے زعمیم سے بیاہ کر ہمیشہ کے لیے رکھ لیں گے۔

ممانی کو ثروت بھی زعمیم کے لیے پسند نہیں تھی ان کے نزدیک وہ بہت گہری اور مہنی تھی۔ اتنے سالوں سے اس گھر میں ہونے کے باوجود بھی دل کی بات ان سے نہیں کی تھی۔ وہ کیا سوچتی تھی؟ کسی کو اندازہ نہ تھا۔ ہاں زعمیم کی پسند اور گھر کے کاموں میں ثروت کی معاونت دیکھ کر اب وہ بھی کبھی کبھی اس بچ پر سوچنے لگتی تھیں۔

”جی ممانی جا رہی ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتی باورچی خانے کی طرف بڑھی تھی۔

”اور ہاں دال کو بگھار بھی لگا لینا، فریزر میں تین چار کباب پڑے ہیں وہ بھی بنا لینا..... صبح سے بھوکا ہے میرا بچہ۔“ وہ اسے تاکید کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

”ہوں بڑا آیا شہزادہ گلنام..... زہر لگتا ہے مجھے اور اسی کے کام جی حضوری کر کے کرنے پڑتے ہیں۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے آگ گوندھنے لگی۔

اسے سلائی کڑھائی کا بہت شوق تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ علاقے میں نیم سرکاری سلائی اسکول کھلا تھا۔ اس نے ماموں سے داخلہ لینے کی بات کی تھی، ممانی نے تو صاف انکار کر دیا۔

”کیا کرے گی سیکھ کر..... درزن بنے گی بھی جی۔ گھر میں پہننے کے لیے سیدھی سادی شلوار نہیں کاٹنی سینا میں سکھا دوں گی..... کوئی ضرورت نہیں ہے داخلہ لینے کی۔“ مگر زعمیم نے بھی ماں سے اس کی سفارش کی تھی۔

”داخلہ لینے دیں امی، اچھا ہے کل کو آپ کے بڑے کام آئے گی، پردے، ہینڈ شیٹ اور یہ جو چیزیں آپ لوگوں کو میسے دے کر بنوائی ہیں، مفت میں بن جایا کریں گی۔ جی ثروت مجھے بھی سردیوں میں سوئٹر

”مطلب یہ کہ اگر وہاں رہی تو وہ تیری شادی اس کالے بھنگ بیٹے سے کروا کر ساری زندگی نوکرانی بنا کر رکھے گی تجھے اور زیور پرناگن بن کر بیٹھی رہے گی یوں چھن پھیلا کر۔“ گل ریز نے باقاعدہ بازو سے چھن پھیلا یا۔

”تو..... ثروت کے کچھ بے نہیں پڑ رہا تھا۔“
”تو یہ کہ تجھے شادی تو صرف مجھ سے ہی کرنی ہے۔ سیدھے طریقے سے تو تیرے ماموں ممانی مانیں گے نہیں تو ہم کورٹ میرج کریں گے۔ شہر بھی چھوڑنا پڑے گا اور نئے شہر میں زندگی شروع کرنے، گھر بنانے کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی تو تو سوچ لے، آگے خود سمجھ دار ہے۔“ وہ بات کے آخر میں ہنسا تھا۔ کندھے پر لال اور پیلا پرنا اور سر پر پشاور کی ٹوپی رکھے بہت پیارا لگ رہا تھا۔ ثروت کو اس کے چہرے کے علاوہ کچھ دیکھنا ہی نہیں تھا۔

”ہاں..... یعنی میں اپنے حصے کا زیور لے کر تیرے ساتھ کورٹ میرج کر لوں؟“ وہ بھی مسکرائی تھی۔

”اپنے حصے کا مطلب! اور جو اتنے سالوں سے ان کی غلامی کر رہی ہے وہ..... روٹی تو لوگ کتے کو بھی ڈال دیتے ہیں۔ تو تو پھر جیتی جاگتی انسان ہے ثروت! سارا زیور..... مگر سن..... زیور تو نہیں چرائے گی..... ایک تیرے دو شکار کریں گے..... دلشاد کو بھی تو پہنکارا دلانا ہے ناں اس لٹی سے..... کیوں دلشاد؟“ وہ اب دلشاد سے مخاطب تھا۔ دلشاد کے چہرے پر خوف تھا مگر آنکھوں میں گل ریز کی باتوں سے چمک ابھری۔

”مطلب..... میں..... میرا کیا کام؟“

”تو ثروت کے بھاگنے کے بعد جائے گی وہاں نوکری کے لیے ظاہر ہے ثروت کے حصے کے کام اس کی موٹی مائی کو کرنے پڑیں گے تو کام والی تو رکھے گی۔ ثروت تجھے زیور کے بارے میں سب بتا دے گی تو خوب خدمت کرنا مائی کی۔ اپنا اعتماد بٹھانا اور پھر موقع دیکھ کر سارا زیور نکال لینا۔ پھر ہم تینوں یہ شہر

چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ تجھے تیرا حاصل جاسے گا اور پھر تیری شادی بھی کسی اچھے سے لڑکے سے کروادیں گے آخر بہن ہے ہماری۔ کیوں ثروت؟؟ گل ریز نے ثروت کو مخاطب کیا۔

”ہوں..... ہاں..... مگر اتنا آسان نہیں ہے مشکل ہو سکتی ہے، انہیں شک ہو سکتا ہے۔“

”شک تو تب ہوگا جب تیرے بھاگنے پر زیور عائب ہوگا تیرے گھر سے بھاگنے کے بعد وہ لازمی طور پر گھر کی نقدی اور زیور چیک کریں گے۔ سب کچھ اپنی جگہ پر ہوگا اور تجھے کون کچھ کہہ سکے گا۔ بالغ ہے، اپنی مرضی سے نکاح کرے گی اور پھر جب بچہ مرے بعد دلشاد اپنی مجبوری بتا کر نوکری چھوڑ کر جائے گی تو کسی کو کیا خبر کہ وہ ساتھ گھر کا زیور بھی لے گئی۔“

گل ریز نے بات کے آخر میں آنکھ دہائی تھی۔ ثروت نے دلشاد کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چہرے پر خوف کے سائے تھے۔

”اور جب کبھی انہیں زیور کی کم شدگی کا پتا چلے گا تب کیا ہوگا؟“

”بھئی ہمیں کیا پتا جب ہم بھاگے تھے تب تو زیور وہیں تھا اور تو دلشاد کی فکر نہ کر، اسے دعائیہ بیچ دیں گے۔ میرا بار ہے دعائیہ میں اس کے لیے رشتہ تو ہم ویسے ہی ڈھونڈ رہے تھے بس تم دونوں سوچ لو۔ ایک طرف خوش حال زندگی اور دوسری طرف غلامی کی زندگی اور یاد رکھنا اپنا حق سیدھے طریقے سے نہ لے تو انہی ٹیڑھی کرنی ہی پڑتی ہے۔“ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے نکل گیا۔ اور وہ دونوں عمر کے اس حصے میں تھیں جہاں اپنے دشمن اور کوئی پرایا بے حد اپنا گتے لگتا ہے۔ دلشاد نے ثروت کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

ثروت اور گل ریز بھاگ کر کسی دور دراز کے گاؤں گئے تھے۔ وہاں گل ریز کا کوئی دوست تھا جس نے نکاح کا سارا انتظام کیا تھا۔ تین مہینے بعد دلشاد بھی پہنچ گئی تھی۔

”بڑی مشکل سے جان چھڑائی تیری ممانی سے
میں جب نوکری کے لیے مٹی تو پہلے تو اس نے نہ کر
دی۔ پتا چلا کہ ہونے والی بہو بھاگ گئی۔ بڑی بدنامی
ہوئی پھر منت ساجت کی تو صفائی کے کام کے لیے رکھ
لیا۔ پراتی تیز کہ اس کمرے میں جانے ہی نہیں دیتی
تھی جہاں سارا مال تھا۔ میں نے بھی خوب اعتماد بحال
کیا، صد شکر کہ سلائی اسکول برقعے میں جاتی تھی ورنہ
تو مکھلے کا کوئی پہچان لیتا۔ خیر آج کل میں میں خود
نوکری چھوڑنے والی تھی کہ اس نے خود ہی بلا کر فارغ
کر دیا۔ میں سیدھی بس میں بیٹھی اور آگئی۔

”اور زیور..... وہ نہیں لائی؟“ کل ریز اتاؤلا
ہوا۔

”لائی ہوں ناں..... یہ دیکھ..... دو دن پہلے ہی
نکال لائی تھی جب ثروت کی مائی کو اچانک کسی نوکری پر
جانا پڑ گیا تھا۔“ دلشاد مکھل کر رہی۔

”نوکری پیچھے رہ گئے سارے دکھ درد سنا ہے۔“
وہ بھی ہنسی اور گل ریز کے چہرے کی پھٹکی مسکراہٹ وہ
دونوں اپنی خوشی میں دیکھ ہی نہیں سکی تھیں۔

”دیکھ کل ریز..... دلشاد نے ہمارے لیے بہت
کچھ کیا ہے، اب ہمارا بھی فرض ہے کہ جلد از جلد اس
کی شادی کروا کر اسے بھیج دیں۔ ماما، مائی آرام سے
نہیں بیٹھیں گے۔ پولیس میں رپورٹ ضرور کروائیں
گے۔“

”ہاں ہاں..... میں کل ہی بات کرتا ہوں اس
نے..... اور تم دونوں فکر کیوں کرتی ہو..... کیا کر لیں
گے وہ..... اور دلشاد نے کون سا چوری کی ہے، بس تیرا
حق تجھ تک پہنچایا ہے..... کس بات کی رپورٹ
لکھوائیں گے وہ۔“ مکھل ریز نے انہیں تسلی دی تھی۔
”میں ہوٹل سے کھانا لے کر آتا ہوں..... تم
لوگ یہ سب سامان صندوق میں رکھ دو۔“ وہ انہیں
تاکید کرتا مکھل گیا۔

دو دن بعد مکھل ریز نے خوش خبری سنائی کہ اس کا
دوست آ رہا۔ مکھل ریز نے اس کی فونو بھی دکھائی۔
دلشاد کو لگا زندگی کے سارے دکھ درد اب ختم ہو گئے۔

ہیں۔ اس نے ثروت کو گلے لگالیا۔
”شاید یہ غلط قدم صحیح منزل کی طرف لے جانے
کے لیے ہی اٹھا تھا۔“ کم عقلی کی عمر کی امتقاندہ باتیں
..... دلشاد نے اپنے تئیں بڑی عقل کی بات کی تھی۔
ثروت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

وہ بڑی دیر تک سوچی رہی۔ اٹھ کر دوسری
چار پائی کی طرف دیکھا..... وہاں کوئی نہیں تھا۔ ”یہ
مکھل ریز کہاں چلا گیا؟“ وہ چپل اس کر باہر نکلی۔
دلشاد ناشتا بنا رہی تھی۔

”مکھل ریز کہاں گیا؟ دلشاد، تو نے دیکھا اسے
جاتے ہوئے؟“ وہ قہقہوں کر ہاتھ منہ دھونے لگی۔

”میں تو سمجھ رہی تھی کہ ابھی تک سو رہا ہے.....
کہاں ہے؟“ دلشاد نے پراٹھا توڑے سے اتارا۔ ”کسی
کام سے گیا ہوگا۔“ اس نے خیال ظاہر کیا۔

”ہاں آج اس کے دوست نے بھی آنا تھا پر
اتنی صبح بغیر بتائے کھڑکا (آواز) بھی نہیں ہوا.....
دلشاد..... وہ۔“ قہقہوں چھوڑ کر وہ کسی خیال کے تحت
دوبارہ کمرے میں آئی..... چار پائی کے نیچے صندوق
جوں کا توں رکھا تھا۔ ایک سانس سکون کا لے کر وہ
مڑی۔ دلشاد دروازے میں کھڑی تھی۔

”تو بھی وہی سوچ رہی ہے ثروت جو میں سوچ
رہی ہوں.....“ کسی انہونی کے ڈر سے دلشاد آگے
بڑھی۔ ثروت نے سر جھٹکا۔

”کیا پاگل نہ ہو تو..... صندوق وہیں رکھا ہے۔“
وہ ہنسی تھی۔

”اور صندوق کے اندر؟“ دلشاد کی بات پر وہ
جیسے سن سی ہو گئی دونوں نے لرزتے ہاتھوں سے
صندوق کھولا خالی صندوق ان کا منہ چڑا رہا تھا، ثروت
کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ وہیں دلشاد کے پیروں
میں گر گئی۔

”ہائے اور با..... اتنا بڑا دھوکا۔“ دلشاد کی چیخ
سنائی دی اور پھر اسے ہوش نہ رہا۔
☆☆☆

”کون تو کل ریز؟ کہاں سے آیا تھا؟ وہ اسے جانتی ہی کب تھی۔۔۔ وہ دو تہہ گیاں رول گیا تھا۔ ثروت نے دلشاد سے واپس جانے کی بات کی تھی۔ دلشاد نے ماحس اٹھائی۔

”میں آگ لگا کر جل مر جاؤں گی پرواہیں نہیں جاؤں گی اور تجھے تو شاید تیرے ماما ماما معاف کر دیں۔ وہ زیم ترس کھا کر اپنا بھی لے پر میں۔۔۔ میں کیا کروں گی۔ کہاں سے لاؤں گی وہ زیور جو تم لوگوں کی خاطر میں چوری کر کے بھاگی تھی میں نے تیری خاطر چوری کی تھی ثروت۔۔۔ زیور کہاں ہے یہ تو جانتی تھی۔ ضرورت تجھے اور کل ریز کو بھی۔ مجھے تو بس مہرہ بتایا تم دونوں نے۔ میں بھی باتوں میں آ گئی۔ اس جہنم سے نکلنے کے لیے یہ کیا کر لیا میں نے۔“ وہ رونے لگی۔

”تیرے تو صرف خواب مرے ہیں دلشاد۔ میرا تو دل بھی مر گیا۔ خالی ہاتھ اور خالی دل ہو گئی میں تو۔“ وہ سسکتی لگی۔

”تجھے کیا لگتا ہے اب آگے ہمارے لیے کوئی راستہ ہے۔“ دلشاد سیدھی ہو بیٹھی رات ہونے کو بھی۔ ”ہاں ہم کل صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ یہ میرے پاس دو ہزار ہے۔ خالہ کے بیٹے سے چوری کیے تھے۔ ہم دونوں کسی دارالامان۔۔۔ نہیں وہاں تو پکڑی جائیں گی کہاں؟“ دوسرے پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”کسی سے بھی مدد مانگ لیں گے مگر یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم یہاں رہ بھی نہیں سکتے یہ مکان کیا پتا کس کا ہے؟ کہیں کسی اور خطرے میں نہ پڑ جائیں۔ کل ریز نے نکاح کے دو بول پڑھ کر بھی اپنی عزت کی حفاظت نہیں کی۔۔۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ ثروت نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ہوں۔“ دلشاد نے گھٹنوں میں سر دے دیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکل رہی تھیں جب ساتھ والے مکان سے ایک عورت نکلی۔

”کہاں جا رہی ہو تم لوگ تو ابھی کچھ دن پہلے

ہی آئے ہوتاں یہاں؟“ اور اس کے سوال کے جواب میں دلشاد نے بتا سونے کچھ کل ریز کے ساتھ یہاں آنے اور کل ریز کے دھوکا دینے تک کی ساری بات اگل دی۔ وہ عورت کتنی ہی دیر حیرت پر ہاتھ رکھ کر کھڑی رہی۔

”تو اب کہاں جاؤ گی تم دونوں؟“ کتنی ہی دیر بعد اس نے قابل ترس نظروں سے ان کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”پتا نہیں، ابھی تو کچھ پتا نہیں۔“ ثروت منستائی تھی۔

”یہاں سے دو گاؤں چھوڑ کر تیسرا گاؤں ہے مشرق کی طرف۔ ابھی گھسنے بعد بس آئے گی وہاں جاتے والی، بھاگ پورا تر جاتا۔ وہاں جا کر کسی سے بھی چاہا برکت طوائی کا پوچھتا وہ ہر حال میں مدد کریں گے تم لوگوں کی۔ بہت نیک خدا ترس انسان ہیں۔ ہاں بس یہ زیور چوری والی بات نہ بتانا۔ یہاں ہو پولیس کے ڈر سے وہ بھی مدد کرنے سے انکار کر دیں۔“ اور اس عورت کو شاید ان رترس ہی آیا تھا۔

”بہت شکریہ پاتی اور اگر کل ریز آ گیا تو اسے ہمارے پیچھے بھیج دیتا۔“ ایک امید ی لگی۔ ثروت کے کہنے پر اس عورت نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں بھاگ پورا والی بس میں بیٹھ کر ایک ان دیکھی ان جاتی منزل کی طرف رواں تھیں۔

☆☆☆

چاچا برکت نے رہنے کے لیے جگہ دے دی تھی مگر پولیس ان کے تعاقب میں تھی۔ وہ کوئی معمولی چوری کر کے نہیں بھاگی تھیں۔ پورے دس لاکھ کے زیور تھے پھر اسے کوئی راستہ بھائی نہ دیا تو خدا نے ایک سبیل نکال دی۔ اسے شک تو کئی روز سے تھا مگر اس شام جب وہ دلشاد کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تو اس نے جو نوید سنائی وہ اس مصیبت سے نکلنے کی بھی نوید تھی۔ اس نے اپنی اولاد کا سودا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فیصلہ مشکل تھا مگر اس کے بعد زندگی بے خوف و خطر ہو جاتی اور پیدا ہونے والا بچہ بھی باعزت زندگی

جھلک..... وہ جو سرکاری ہسپتال کے لیبر روم میں اس کی زندگی کا کل گئی۔

☆☆☆

(10 اپریل 2018ء)

”پاپا! کب سے کہہ رہی ہوں، آپ ایک بار ارمان سے مل لیں اب تو وہ فاران سے اپنی تعلیم مکمل کر کے بھی آ گیا ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں اگر وہ آپ کو پسند نہ آیا تو میں ناراض نہیں ہوں گی بلکہ جہاں آپ کہیں گے وہاں خاموشی کے ساتھ شادی کر لوں گی۔“

اصباح باپ کے محلے سے لگی بڑے لاڈ سے کہہ رہی تھی۔ زیم نے صیک اتار کر ایک طرف رکھی اور بازو سے پکڑ کر اصباح کو سامنے بٹھالیا۔

”تو ملوؤ ناں مجھے ارمان سے..... میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تمہاری دادی کو اس کنڈیشن میں چھوڑ کر ہم نہیں جا سکتے..... بیٹا دادی بہت بیمار ہیں..... ماما ہوئیں تو اور بات تھی مگر اب..... آپ ایسا کر دو کہ ارمان کو اور اس کی ماما کو انوائسٹ کر لو کسی دن ڈنر پر، میری ملاقات بھی ہو جائے گی۔ ذرا فیملی بیک گراؤنڈ بھی پتا چل جائے گا۔“ اور ان کی بات پر وہ تھوڑی دیر خاموش ہوئی۔

”ہاں کہہ دوں گی مگر ارمان بتا رہا تھا کہ اس کی ماما بہت عبادت گزار اور باپردہ خاتون ہیں۔ بہت کم گھر سے نکلتی ہیں مگر پھر بھی، میں بات کر کے دیکھوں گی، ہماری خاطر تو نکلیں گی وہ گھر سے۔“ بات کے آخر میں وہ مسکرائی تھی اور اسے خوش دیکھ کر زیم بھی مسکرائے۔

☆☆☆

بیوی کی موت کے بعد ان کی زندگی بس بیمار ماں اور اکلوتی بیٹی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ بابا کی وفات کے بعد فیکٹری کا کام بہت بڑھ گیا تھا۔ اب شہر سے باہر بھی کپڑا جانا تھا اور کچھ ریڈی میڈ کارمنٹس کا کام بھی تھا۔ شہر سے باہر اطراف کے قصبوں چھوٹے گاؤں سے بھی کاری گر خواتین کام کر

گزارتا ایک شام جب وہ قریبی درگاہ پر اپنے گناہوں کی معافی مانگنے اور اللہ سے مدد مانگنے کی غرض سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے کھڑی تھی تب ہی کوئی نادیدہ طاقت اسے درگاہ کے عقبی حصے میں لے گئی جہاں اسے شہولی۔ شبو وہ پہچان..... جس کا نام شبنم تھا..... جس سے وہ دل کی ہر بات کہتی چلی گئی جس نے اس کا مسئلہ حل کیا تھا۔ جس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

”آہ.....“ وہ جیسے خیالوں سے لگی۔ ایک طویل مسافت کی محسن جوڑ جوڑ میں محسوس ہو رہی تھی۔ بچے کی پیدائش کے بعد وہ بھاگ پور سے بھی آگے کے گاؤں میں چلی گئی تھیں شبو سے وہ پھر کبھی نہیں ملی۔

”کیا ہوا ثروت..... تم ابھی تک ادھر ہی بیٹھی ہو۔ بس کروان کپڑوں پر تربانی بھی میں کر دوں گی اور بٹن بھی لگا دوں گی۔ تم بس آرام کرو اب۔“ دلشاد چادر اوڑھتی گھر سے نکل گئی۔

وہ دونوں جس گاؤں میں رہتی تھیں یہاں سے قریب ہی مین سڑک پر ایک بوتیک تھی۔ جہاں سے سڑک شہر کی طرف جاتی تھی۔ وہ دونوں وہاں کے لیے ہی سلائی کا کام کر کے گزار کرتی تھیں۔ پچیس سال پہلے وہ شہر گئی تھیں، ماموں ممانی کا نقصان بھرنے دیں سے پتا چلا کہ دلشاد کی ماسی اب دنیا میں نہیں رہی وہ دونوں سارے راتیں خواب ہمیشہ کے لیے دفن کر کے بڑی بڑی چادروں میں خود کو لپیٹے وقت سے پہلے بیوہ بن کر ایک گاؤں کے بوسیدہ مکان میں زندگی گزارنے لگیں۔ نہ کبھی کسی نے ذاتی زندگی میں مداخلت کی کوشش کی، نہ انہوں نے کسی کو موقع دیا۔ وہ کم عمری سے چٹکی اور پکی عمر تک پہنچنے کے لیے ایک غلطی کے پل سے گزری تھیں..... لوگ باتیں بناتے ان کی تنہائی پر..... بے اولادی پر۔

”دونوں کے شوہر ایک حادثے میں مر گئے، بے چاری بہنیں ہیں، دونوں ہی بیوہ۔“ لوگ ترس کھاتے اور وہ سلائی مشین کے آگے جھکی رزق کا سامان کرنے میں جتنی رہتیں۔ ثروت کو بابا، ماما، زیم اور کل رین کی شکلیں بھی یاد نہ رہیں۔ یاد تھی تو بس ایک

کے بھراتی تھیں۔ یوں کام پہلے سے زیادہ پھیل چکا تھا۔

☆☆☆

”ثروت وہ بوتیک والی ہاجی کہہ رہی تھیں کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ معاوضہ بڑھانے اور سامان کے لیے پیشگی رقم کے سلسلے میں قریبی گاؤں میں میٹنگ ہے۔ ساری ورکرز جائیں گی۔ سنا ہے اس مرحلہ پر اسلی مالک آ رہا ہے جو اس سارے کام کا مالک ہے جس کی فیکٹری سے سارا کپڑا آتا ہے، ہم بھی پیسے کے ثروت..... سنا ہے فیکٹری والے مفت میڈیکل کیمپ بھی لگاتے ہیں تو اپنی آنکھیں بھی چیک کر دیا لیتا۔“ دلشاد نے جو بوتیک میں سارا مال دے کر آئی تھی، چادر اتار کر کھوٹی سے لگائی اور وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہ تو اچھی خبر ہے۔ معاوضہ بڑھ جائے گا تو میٹنگ کے اس دور میں گزارہ بہترین ہو جائے گا اور اگر علاج معالجہ بھی مفت ہو جائے تو اور بھی اچھا ہے۔“ وہ باورچی خانے سے نکلی۔ آج بہت دن بعد آلو گوشت کا سالن پکایا تھا۔ وہ سلاد اور رائیہ بنا رہی تھی۔ روٹیاں دلشاد آتے ہوئے راستے سے ہی لے آئی تھی۔

”کب ہو گی میٹنگ؟“ وہ برآمدے میں چٹائی پر کھانے کے برتن رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ دلشاد وہیں صحن میں گئے تل پر ہاتھ منہ دھو رہی تھی۔

”اگلے ہفتے سنا ہے فیکٹری کا مالک پہلے تقریر کرے گا، معاوضے بڑھانے کا اعلان کرے گا۔ وہیں سب ورکرز اپنے اپنے میڈیکل کارڈز کے لیے نام بھی لکھوائیں گی پھر میٹنگ کے بعد چند خوش نصیب ورکرز کے علاج کا ذمہ فیکٹری کا مالک لے لے گا..... اب دیکھو۔“ وہ چٹائی پر آ بیٹھی۔

”چلو معاوضہ تو ہو جائے علاج بعد کی بات ہے۔“ وہ سر جھکائے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

”سنو ارمان۔“ وہ بہت دنوں بعد یونیورسٹی آیا

تھا اپنے پرانے دوستوں سے ملنے۔ جب ہی اس سے بات کرنے آ گئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی مسکایا۔

”ہاں اصباح کہہ..... خیریت ہے ناں؟“ اس کے سامنے آ رکھا۔

”ہاں ارمان سمجھو خیریت ہے بھی اور نہیں..... جہیں تو پتا ہے کہ میری دادی کی کنڈیشن ابھی ہے کہ ہم انہیں تھوڑی دیر کے لیے بھی چھوڑ کر نہیں سکیں۔ ان دنوں تو بابا بھی بالکل گھبرائی ہیں۔ میں یونیورسٹی سے جاتی ہوں تو بابا فیکٹری جاتے ہیں۔ وہ چارہ رے تھے کہ اگر تم اپنی ماما کو لے آؤ دادی کی ملاقات بھی ہو جائے گی اور ہم لوگ تفصیلی بات کر سکیں گے..... مگر تمہاری ماما تو کبھی آتی جاتی ہی نہیں۔“ اصباح کی پوری بات سن کر لختہ بھر کو خاموش ہوا۔

”جہیں بتانا چاہیے تھا اپنے بابا کو..... میری تو نہیں آ سکیں گی۔ وہ پاؤں سے مٹی کھرچنے لگے جوتے کی ٹوہ پر گرد لگ گئی۔

”مگر ایسا کیوں ہے ارمان..... ہماری زندگی کا سوال ہے اور اگر میرے بابا آتے ہیں لوگوں کے گھر تو کیا تب بھی وہ بابا سے نہیں ملیں گی اصباح کو غصہ آ گیا۔

”اصباح مجھے تم سے بھی بہت سی باتیں پتہ ہیں، میری ماما، میری نانی، ان سب کے بارے میں مگر اس سے پہلے اصل میں ماما اور نانی بہت باہمی ہیں۔ بہت عبادت گزار وہ دنیا کے معاملات سے دور ہی رہتی ہیں بس ان کی دنیا مجھ تک ہی محدود ہے۔“ تو اس طرح بات آگے کیسے بڑھے ارمان.....؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”اچھا..... میں بات کرتا ہوں ماما سے۔“ بہت فکر مند دکھائی دینے لگا اور پھر وہیں مڑ گیا۔ اصباح کو اس کا یہ رویہ بہت عجیب سا لگا۔ وہ سوچا ماما پڑھتی۔

☆☆☆

کھانے کی میز پر برپانی کی ڈش رکھی تھی۔ ساتھ تین پلیٹ اور چمبھی رکھے تھے۔ وہ ان دونوں کی سمت دیکھتا خاموشی سے آکر کھانے کی نیت سے بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ہی سمجھ گئی کہ کوئی پریشانی ہے۔ ”کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ ماں نے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس ہاتھ میں عجیب سی محبت تھی۔ مستی اور باپ کی شفقت کا ملا جلا سا احساس تھا۔

”نہیں..... کچھ نہیں۔“ وہ کھانا کھانے لگا۔ ”کچھ تو ہے..... جو تم چھپا رہے ہو اپنی ماں سے۔“ وہ غرور مند ہوئیں۔ ارمان نے نانی کی سمت دیکھا۔ وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتی بمشکل اٹھیں اور وہاں سے چلی گئیں۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی۔ وہ جب بھی وہاں آتی تھیں کبھی بھی ان دونوں کے ذاتی نوعیت کے معاملات میں مداخلت نہیں کی ہوئیں۔

”کیا بات ہے ارمان؟“ وہ اب پریشانی سے بولیں۔ ”ماں..... اصباح کے بابا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ ہم دونوں کی شادی کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اصولاً تو آپ کو رشتہ لے کر جانا چاہیے تھا مگر..... وہ خاموش ہو گیا۔

”نہیں..... میں کیسے جاسکتی ہوں؟“ ان کی اس بات پر ارمان نے پہلی مرتبہ خفگی اور غصے سے ان کی سمت دیکھا تھا۔ ”ماں جب کوئی بھی لڑکی شادی کے بعد اس گھر میں آئے گی میری بیوی بن کر تو..... جب، جب کیا ہو گا؟ اسے بھی تو ساری حقیقت پتا چل ہی جائے گی ناں تو..... کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم ابھی ہی بتا دیں ان لوگوں کو..... پھر آریا پار..... جو بھی ہو..... وہ تو ایک دن ایک دن ہونا ہی تھا..... اور اصباح کی محبت کی آزمائش بھی ہو جائے گی۔“ وہ پھٹ پڑا۔ وہ چند لمحوں خاموش رہیں۔

”ٹھیک ہے..... ہم کل شام چلیں گے ان کے ہاں..... میں اور تمہاری نانی۔“ وہ مان گئیں۔

ارمان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی۔ ”آپ بہت اچھی ہواں..... اور میری پیاری ماں ہو۔“ وہ ان کا ہاتھ تھام کر بولا تھا۔ ”تو بھی بہت اچھا ہے میرا ارمان بیٹا۔“ وہ ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ ”اور کل شام نہیں، کل تو اصباح کے بابا کو کام کے سلسلے میں کہیں جانا ہے، اسی لیے وہ کل یونیورسٹی بھی نہیں آ رہی۔ ہم ایک دو دن کے بعد چلیں گے۔“ وہ مسکراتے ہوئے کھانے پر جھک گیا۔

☆☆☆

بہت بڑا گراؤنڈ تھا۔ تاحد نگاہ لوگ ہی لوگ..... آس پاس کے گاؤں سے درکرز، عورتیں، مرد، بچے سب ہی آئے تھے۔ ایک پل کے لیے تو زمیم ساکت کھڑے رہ گئے۔ بابا کا لگایا کام اتنا پھیل چکا تھا۔ انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ عظمت صاحب کی یہ کارمنش فیکٹری..... اب صرف ایک فیکٹری نہیں تھی۔ ایک برانڈ بھی جس کے نام سے بہت سی دکانیں..... بوتلیں اور ڈیزائنز کام کر رہے تھے ایک خوشی کا احساس تھا جو ناقابل بیان تھا۔ درکرز کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ان کے چہروں پر لکھی غربت اور مجبوری کو وہ ہا آسانی پڑھ سکتے تھے۔

دھوپ میں بیٹھی درکرز پر نظر دوڑاتے ایک چہرے پر نظریں ٹھہری گئی تھیں۔ وہ چہرہ کچیس سال کے بعد نظر آیا تھا..... بلاشبہ وہ ثروت ہی تھی..... جس سے کبھی انہیں محبت ہوئی تھی جو ان کی محبت کو ٹھکرا کر کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ وہ سر جھکائے بس سن رہی تھی۔

”شاید اس نے غور سے دیکھا نہیں۔“ دل میں سوچتے ہوئے انہوں نے تقریر مختصر کر کے معاوضے بڑھانے کا وعدہ کیا۔ خوب تالیاں بجنیں۔ وہ ابھی بھی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور آنکھوں پر ہاتھ کا چھپا ہوا کر میڈیکل کارڈ کے لیے اپنا نام لکھوایا۔

”ثروت..... ثروت گل ریز..... بیوہ ہوں جی

نفر گزرو اور دلی ہے۔ یہ بھی بھی ہر چہ وہ نہ لاکھائی
 دے۔ ہر چہ وہ نہ لاکھائی ہے۔ وہ چلنے کے
 لیے ساری تفصیل گھوم رہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ وہ انہیں
 پہچان کیوں نہ کی تھی۔ یہ تیر اور وقت کے ساتھ ملے۔
 دل بھی چکا تھا۔ بالوں میں سنہری چتر آئی تھی۔ خود
 انہیں نھر کر ایک لگ چکی تھی۔ بلی بھی دھڑکی رہی تھی
 تھی۔ یہ کہ جو پہلے بہت پکا کہتا تھا اب آسمانوں میں
 رہنے اور خود مختاری کی زندگی گزارتے گزارتے
 قدرے بہتر ہو چکا تھا۔

دینا ہے جس کی اکل جرح ہے۔ "مورخوں نے
 "مورخوں نے کہا کہ یہ ہے۔" "مورخوں نے
 "مورخوں نے کہا کہ یہ ہے۔" "مورخوں نے
 "مورخوں نے کہا کہ یہ ہے۔" "مورخوں نے

”میں چلوں گی۔“ ایک لمحے کی دیر کیے بنا اس نے ہائی بھر لی۔

زندگی میں بہت غلط فیصلے کیے تھے۔ اپنے برائے کی پہچان نہیں تھی۔ وہ اب اتنے سالوں بعد ملنے پر بھی کوئی گلہ نہیں کر رہا تھا نہ کوئی شکوہ اور مایہ..... وہ اسے یاد کرتی تھیں یعنی ان کے ذہن میں اس کی یادیں تھیں۔ وہ آباد تھی ان کی یادوں میں۔ اس گھر میں اس کے نام کی پکار آج بھی اٹھتی تھی اور جس کی خاطر ان سب کو چھوڑا تھا وہ نہ جانے کہاں تھا۔ اسے یاد بھی تھا کہ نہیں۔ اسے تو یہ بھی نہیں خبر تھی کہ جسے بیوی بنا کر دھوکا دیا وہ اس کی اولاد پیدا کر چکی تھی۔ وہ خشک آنسوؤں سے اندھی ہوتی آنکھوں کا چپک اپ کروانے فیکٹری کی ٹیم کے ساتھ شہر روانہ ہوئی۔ دلشاد کو اس نے ساری بات بتا دی تھی۔

”پرسوں صبح تک آ جاؤں گی۔“ وہ فیکٹری کی دوسری عورتوں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گئی۔

☆☆☆

آج روٹھے ہوئے سا جن کو بہت یاد کیا اپنے اجڑے ہوئے کلشن کو بہت یاد کیا جب کبھی گردشِ فکر نے گھبرا ہے نہیں گیسوئے یار کی اہمیت کو بہت یاد کیا آج لو لے ہوئے سپنوں کی بہت یاد آئی آج پیٹے ہوئے سادوں کو بہت یاد کیا

(سافر صدیقی)

چارپائی پر لینا مفلوج وجود چھت کی کڑیاں من رہا تھا اور آسو بہار ہا تھا۔ رقیہ لے بے بسی سے دیکھا پھر اپنی بڑی بیٹی کو آواز دینے لگی۔

”عشرت..... بیٹا دودھ پتی لے آ..... تیرے ماموں جاگ گئے انہیں دودھ پتی پلا کر دوائی کھلا دوں۔“ وہ آواز دے کر وہیں گل ریز کی پاکتی پر بیٹھ گئی۔

میں سال ہو گئے تیرے ایکسی ڈنٹ کو بھائی مکل ریز اور اٹھارہ سال ہو گئے مجھے طلاق کا داغ اور تین بیٹیاں لے کر تیرے در پر آئے، نہ تیری حالت

بدلی اور نہ تیرے یہ آنسو۔ کس کے لیے بہاتا ہے، کس کی آہ لے کر لے پڑا ہے بستر پر، کس کی بد دعا لگاوا دی مجھے بھی۔ میں تو آج تک نہ سمجھ سکی کہ تیرے پاس میری شادی کے لیے، اماں کے آپریشن کے لیے اسکوٹر کے لیے اتنی رقم کہاں سے آئی تھی..... تو نے جس کے مال پر بھی ہاتھ مارا تھا ناں..... سچ کہوں تو اس کی آہ مگی ہے۔ اماں کا آپریشن تو کامیاب ہو گیا پر سچ نہ سکی..... میرا گھر اجڑ گیا اور تیرا ایکسی ڈنٹ..... وہ تو بھلا ہوا امجد کا جو تجھے ہم تک لے آیا..... ورنہ وہاں سڑک پر انجان شہر میں خون میں لت پت پڑا رہتا تو کیا کر سکتے تھے ہم۔“ رقیہ رونے لگی۔ وہ جنور چھت کی سمت دیکھتا رہا۔

”جب تک تجھے معافی نہیں ملے گی سکون کی موت بھی نہیں آئے گی۔“ وہ بڑبڑاہٹ کے انداز میں بولی تھی۔

عشرت دودھ پتی لے آئی اور سہارا دے کر ماموں کو اٹھانے لگی۔ وہ گھومت گھومت اس کے حلق سے اتارنے لگیں۔ وہ بے بسی کی تصویر بننا عتابی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک معصوم چہرہ لگا ہوں میں ایسا بسا تھا کہ اور کوئی منظر دکھائی ہی نہیں دیتا تھا جسے اپنا نام دے کر خود اپنے ہاتھوں سے جانے لگی شو کریں کھالے کے لیے چھوڑ آیا تھا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں بالکل خاموشی تھی۔ وہ دونوں

خواتین سر سے پاؤں تک بڑی بڑی چادروں میں لپیٹیں ہوئی تھیں کہ ان کے ہاتھ اور پاؤں بھی ان چادروں میں چھپے ہوئے تھے۔ بس ایک ایک آنکھ دکھائی دے رہی تھی جس سے وہ سب کو دیکھ رہی تھیں۔ اس صبح بہت خوش تھی آج ہی شروت پھوپھو بابا کے ساتھ گھر آئی تھیں دادی سے مل کر ان کے گلے لگ کر بہت روئی تھیں۔ دادی نے بھی لڑنا کا پتا ہاتھ ان کے سر پر رکھ دیا تھا اور اب ارمان کی ماما اور نانی آئی تھیں۔ بابا لے لی رشتہ کی بات پھیلنے لگی جواہر وہ کوئی بھی بات محل کر کرنے کے بجائے بس ہوں

ہاں میں جواب دے رہی تھیں۔ زمیم ان کی جھجک کو محسوس کر کے باہر آئے تھے۔

”ثروت“ وہ جو ممانی کے پاس بیٹھی ان سے پرانی باتیں کر رہی تھی ان کی سمت دیکھا۔

”اچھا تو نہیں لگتا مگر تم ایک احسان کر دگی مجھ پر۔“

”جی کیسے؟“ وہ اٹھ مئی۔ عین یکم کی نظریں بھی بیٹے پر جا گئیں۔

”وہ اصباح کے رشتے کے سلسلے میں لڑکے والے آئے ہیں مگر دونوں خواتین بہت باپردہ ہیں، مجھ سے بات کرنے میں جھجک رہی ہیں تو اگر تم آ جاؤ اور بات کر لو تو.....“ آخر تم اصباح کی پھوپھو ہو۔“ بات

کے آخر میں بڑے مان سے کہا تھا۔ اس نے کیا کیا تھا ان سب کے ساتھ اور وہ کتنی عزت دے رہے تھے۔

وہ اثبات میں سر ہلاتی ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ ”السلام علیکم..... میں اصباح کی پھوپھو

ہوں۔“ اس کے تعارف کروانے پر ارمان کی ماما کھڑی ہو گئیں۔ اصباح اور ثروت نے حیرت سے

ان کی سمت دیکھا تھا۔ ”آپ بیٹھیں ناں آنٹی۔“ اصباح نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

”آپ.....“ ثروت نے غور سے اس کی آنکھ کی طرف دیکھا۔ چادر سے نظر آتی آنکھ..... اس کا

قد کاٹھ اور وہ آنکھ کچھ عجیب سا لگا تھا۔ ”جی.....“ وہ گھبرا کر بولی تھیں وہ آواز..... وہ

لمحے کے ہزارویں حصے میں اس آواز کو پہچان گئی تھی۔ جسم پر چمکی سی طاری ہوئی۔ کیا سارے اتفاقات ایک ساتھ

ہونے ہیں..... کیا دنیا اتنی سبک دلی ہے۔ ”شبو“ ایک سسکی سی حلق سے نکلی تھی۔

”باجی۔“ ایک ہاتھ اس کے سر پر آ رکھا تھا۔ اس ہاتھ کے لمس کو، اس کی شفقت کو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔

وہ فرشتے کا ہاتھ تھا۔ اصباح حیرت سے منہ کھولے سب دیکھ رہی تھی چادر سرک کر ڈھلک گئی تھی۔ اس

منظر کو دیکھ کر دوسری عورت نے بھی چہرے سے چادر منظر کو دیکھ کر دوسری عورت نے بھی چہرے سے چادر

سرکا کر جیسے کھل کر سانس لیا تھا۔ اصباح کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھانے لگا۔ دو ٹکڑے اس کے

سامنے کھڑے تھے..... وہ اس کا رشتہ لے کر آئے تھے..... وہ چکر اکر صوفے پر گر گئی۔

”اصباح۔“ وہ سب اس کی طرف مڑی تھیں۔ ثروت کے سوال اس کے دل میں عی رہ گئے تھے۔

☆☆☆

”وہ میری ماں ہیں..... صرف میری ماں۔ جو راتوں کو اٹھ کر تجھ کے نفل پر مڑتی ہیں۔“

حفاظت کی دعا میں کرتی ہیں وہ بچپن سے مجھے بھی کہتی آئی ہیں کہ میں ان کے پاس امانت ہوں مگر میں

نے ہمیشہ ان سے ہی محبت کی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ وہ میرے لیے ماں بھی

ہیں اور باپ بھی۔ جب سے میں ان کی گود میں آیا۔ وہ لوگوں کی شادیوں پر ناچنے والا لہجہ انہیں رہیں بلکہ

میری ماں بن گئیں..... وہ لوگوں کے بچے پیدا ہونے پر ودھائیاں لے کر گانے والی میرے لیے لہریاں

گانے لگیں۔ آیت الکرسی پڑھ کر دم کرنے لگیں۔ وہ بس میری ماں ہیں اصباح..... تم لوگوں کی نظر میں

وہ ایک لہجہ ہیں مگر میری جنت ہیں وہ۔“ وہ ہر جھکائے اصباح کے سامنے بیٹھا تھا۔

زمیم جو ڈاکٹر سے اصباح کی ڈرپ کے سلسلے میں بات کرنے گئے تھے باہر دروازے پر ہی رک

گئے دماغ الجھ سا گیا تھا۔ ”کھن آ رہی ہے مجھے تم سے ارمان۔ تم بھی

سے لے کر جوانی تک ایک لہجے کو ماں ماننے رہے۔ اس نے تمہیں پروان چڑھایا۔“ اور اصباح کی غرت کو

محسوس کر کے وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔ ”بیٹا.....“ زمیم نے کچھ کہا جانا۔ اس نے

ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور ہاسپٹل کی بلڈنگ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں وہ آنے سامنے بیٹھی تھیں۔ اصباح کو ہاسپٹل چھوڑ کر وہ ایک بار پھر شبو کے سامنے

اسلام علیکم!

ہمیں اپنے Blog Kitabdost

<http://kitabdostpk.blogspot.be>

اور readingpoint

<http://readingpointpk.blogspot.be>

کے لیے لکھاریوں کی ضرورت ہے جو ہمارے لیے ناولز

لکھ سکیں جو خواتین و حضرات شوقین ہیں وہ

ہمیں اپنی تحریر (ناول، ناولٹ، افسانہ قسط وار ناول)

اس میل آئی ڈی پہ سینڈ کر سکتے ہیں

maisrasultan@gmail.com

فیس بک پہ بھی اس میل کے ذریعے رابطہ کریں

ہوتا ہے۔“ وہ میرے سے مسکرائی تھی۔

”ابھی چار دن پہلے ہی مجھے پتا چلا کہ جس فیکٹری کے لیے میں اور دلشاد کام کرتی ہیں وہ زمیم کی ہے۔ زمیم کسی میٹنگ کے سلسلے میں آئے، مجھے پہچان لیا اور مرانی سے ملاقات کے لیے میں دو دن کے لیے آگئی۔ مگر شاید یہ بھی بہانہ تھا، تجھ سے ملاقات کا بہانہ۔ اپنے بچے سے ملنے کا بہانہ۔“ وہ رونے لگی۔

”تجھے یاد ہے باجی تو نے ہسپتال میں ایک کاغذ پر دستخط کئے تھے۔“ شبونے کچھ یاد کروایا۔ وہ جیسے سارے حق کھوجی تھی..... یاد آنے پر آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھ گئی۔

”ہاں ایک لمحے کو بھول گئی تھی کہ میں نے اسے بچا تھا۔“ دروازے کے پنڈل پر نگے ارمان کے ہاتھ اپنی دونوں ماؤں کی بے بسی اور محبت پر لرزے تھے۔

”تب وہ کاغذ ارمان کو گود میں لیتے ہی میں نے بھاڑ دیا تھا اور خدا اور خود سے ایک وعدہ کیا تھا جب بھی مجھے توئل جائے گی تو میں تیری امانت تیرے حوالے کر دوں گی۔“ اور اس بات پر ارمان ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر گھسا۔ ثروت اسے دیکھتے ہی جیسے پتھر کی بن گئی۔ وہ ہو بہو گل ریز جیسا تھا۔

”ارمان۔“ شبو کے منہ سے اس کا نام کسی حسرت کی طرح ادا ہوا تھا۔ ثروت وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کی نفرت دیکھنے سے پہلے موت آ جانی۔

☆☆☆

”دیکھو بیٹا..... کوئی بھی لڑکی کسی ایسے سسرال میں بیاہ کر کے آئے گی جہاں نہ مرد ہیں نہ عورتیں، ساس اور نانی ساس کے نام پر دو لکڑے ہیں۔ یہ ہماری پہچان ہے بیٹا تم ٹھنڈے دل سے سوچو، اصباح کی نفرت بجا ہے اور پھر تمہارے ہوس سنبھالتے ہی میں نے اور تمہاری ماں نے تمہیں یہی بتایا کہ تمہاری ماں کی کوئی مجبوری تھی۔ تم ہمارے پاس اس کی امانت ہو۔ تم نے ہمیشہ ایک سمجھ دار بچے کی طرح ہماری ہر بات سنی۔ لوگوں نے ہمارے حوالے سے تم سے مذاق کیے ہاتھ بنا میں مگر تم نے سب کو

خاموش کروا دیا۔ مگر بیٹا اب معاملہ تمہاری زندگی کا ہے اور خود سوچو کہ جب تم کام پر ملے جایا کرو گے تو ہمارے ساتھ رہنے میں جبکہ محسوس کرے گی۔“

”تو کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ چھوڑ دوں؟“

آپ کو؟“ وہ نانی کی طرف گھوما۔

”تیری ماں بھی تو ہے وہ دیکھ اللہ کتنے عجیب وقت اسے لے کر آیا ہے جب تجھے ضرورت ہے اس کی۔ خدا کے فیصلے ہیں بیٹا مان جا اور مجبوری تھی اس کی۔“ شبونے حسب عادت اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”مجبوری۔ ایسی کیسی مجبوری کہ کچھ دیا مجھے۔ تو نے خرید لیا ماں اور پھر بھی کہتی رہی کہ امانت ہے۔“ وہ سسک پڑا۔

”بتاتی ہوں..... سب بتاتی ہوں میں کہ کیا مجبوری تھی اس کی..... پھر بتانا کہ قصور کس کا تھا تیری ماں کا..... اس کے حالات کا..... یا پھر تیرے باپ کا؟ شبو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں گرد سے اسے سب بتانے کی اجازت لی۔ ارمان نے دیکھا نانی نے ماں کو ہاں میں اشارہ کیا تھا۔

☆☆☆

فضا میں خشکی بڑھ گئی تھی۔ سر شام ہی گرم چادریں پہننے کو دل کرتا۔ وہ آنکھوں میں ڈاکٹر کے دیے قطرے ڈال کر سر کرپی کی پشت پر اوپر کی طرف نکائے آنکھیں موندھے بیٹھی تھی۔ دلشاد نے اس کی ٹانگوں پر گرم چادر ڈالی اور چائے کا پیالہ ساتھ رکھی بیڑا پر دھرا۔

”چائے پی لے ثروت۔“ وہ وہیں چوکی پر بیٹھ گئی۔

”وہ بالکل گل ریز جیسا ہے دلشاد۔ مجھے کا وقت کہیں پیچھے کو پر لگا کر اڑ گیا ہے اور وہاں جا کر ٹھہر گیا ہے جہاں میری نظروں میں گل ریز کا چہرہ ٹھہر گیا۔“

یونہی آنکھیں موندھے بولی تھی۔ دلشاد نے گور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس چہرے پر ایک اطمینان تھا ایک سکون تھا جو کم شدہ چیز کے ملنے کے بعد ہوتا ہے۔

”شہو نے اس کی خاطر اپنی زندگی ہی بدل لی، کہاں ہوتا ہے ایسا؟ ہم مکمل لوگوں سے زیادہ تو وہ انسان نکلی رشاد جس کی کوئی پہچان ہی نہیں۔ اور وہ اس کا کردہ..... اس کو کھیل گیا میرے بچے کی خاطر اپنا لہکانا بدل کر..... اپنی زندگی بدل کر..... میری مجبوری میں ساتھ دیا میرا۔ اپنی ساری زندگی کی کمائی میرے قدموں میں لایا۔ نکلی اور میری ساری زندگی کی کمائی کو کہے سنبھالی کر رکھا۔“ وہ اب سیدھی ہو بیٹھی آکھیں ابھی ابھی بندھیں۔

”وہ اب پھر سودا کرے گی تیرے ساتھ..... تجھ سے اپنا پیسہ واپس لے کر اور مان تیرے حوالے کرے گی۔“ (لشاد نے غصہ ظاہر کیا۔)

”امانت..... ہاں شاید۔“ وہ آنکھیں کھولے
دلدادگی بات پر غور کرنے لگی امانت یا کر دی..... نہیں
شبوار ایسی نہیں ہے۔ وہ ایسی ہوتی تو جب مجھے بتا دیتی
کہ کوئی میرا بچہ لینے کو تیار نہیں اور وہ خود میری مدد کر
رہی ہے۔“ وہ خود کو اب پر سکون رکھنا چاہتی تھی۔

”ہاں..... اور کیا چاہتا ہے کہ تو بھی زندگی میں طے کی بھی کہ نہیں اور اگر اس کا مقصد سودا ہی ہوتا تو وہ اربان کی خاطر اپنا طر زندگی کیوں بدلتی، تاپنے لگانے اور دھاتیوں مانگنے کے بجائے ایک عبادت گزار انسان کیوں بن جاتی۔ وہ بس ماں بن کی ثروت اس نے تیرے بچے کو ماں بن کر پالا.....“
دلشاد نے جائے کا پال لیں سے لگا لیا۔

ایک مرد کوٹن نے دھکارا، ایک نے مجھے۔
ایک عورت نے ساری زندگی میرا ساتھ دیا۔ میرے
ساتھ اس نے بھی خواب دیکھے، میرے ساتھ وہ بھی
برباد ہوئی۔ اس ساری کہانی میں جو نقصان آواؤں سب
کے حصے میں آیا..... کام آیا تو کون نہ وہ مرد..... نہ
میں دو..... ایک نکلا..... رپ نے دلہن بھی کیا کچھ
چالی ہے دلاؤ..... ہر جسم میں چھوٹتا ہے مگر رپ ہے
تعلق ہر کسی کا الگ ہے۔ میرا تعلق الگ تھا میرا الگ
اور اس شہد کا سب سے لی الگ..... سب سے لی
الو کہا..... شہوت نے آہ بھری۔ دلاؤ نے اثبات میں

☆☆☆

ماں اسے دیاں لے کر مٹی تھی جہاں امی اور ماں کی ملاقات ہوئی تھی۔ اسی درگاہ کے عینی احاطے میں دریا کی طرف اترتی میڑھیوں پر بیٹھا وہ ساری کہانی اور اس سے جلے کرداروں کے بارے میں سوچ رہا تھا یہ اس کی زندگی کی کہانی تھی۔ وہ اپنی ماں کی محبت کے جرم کو جرم نہ کہہ سکا۔ وہ خود اسی دور سے گزر رہا تھا۔ اسے اپنے باپ کی بے وفائی کا دکھ تھا، شکوہ تھا مگر کس سے کرتا۔ انہیں تو شاید خبر بھی نہیں ہوگی کہ ان کی کوئی اولاد ابھی ہے۔ اسے خود سے بھی غم نہیں آئی۔ جب ہوش سنبھالا تو ماں اور نانی کے چہرے عجیب لگتے تھے، ان کی آوازیں۔ پھر اس کے دوستوں نے پوچھا کہ وہ لکڑیوں کے ساتھ کیوں رہتا ہے تب اس نے گھر آکر ماں سے یہ ہی سوال کیا تھا۔ نانی اور ماں نے بڑے طریقے سے اسے یہی بتایا تھا کہ اسے پیدا کرنے والی ماں کسی مجبوری میں اسے ان کے پاس امانت کے طور پر چھوڑ کر گئی ہے۔ پھر اس نے بھی کوئی سوال نہ کیا تھا۔ ماں کی محبت نے ہمیشہ زبان پر لکائے رکھا۔ وہ پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا تب احساس ہوا کہ وہ دونوں لکڑے پہنچی آخرت سنوار رہے ہیں اور وہ بہت اچھے انسان ہیں تب اس نے خود سے مہذب کہا کہ اس کی اصلی ماں جو کوئی بھی ہوگی اس کی جو بھی مجبوری رہی ہوگی اس کی ماں جو اس کے سر پر اپنا مردانہ ہاتھ رکھ کر محبت سے میرا ڈٹا رہی ہے..... وہی رہے گی۔

مگر اب اپنی ماں کی کہانی سن کر اسے ہم دیکھنے والی سے بھی محبت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا گناہ شاہیہ انتہائی نہیں تھا جتنی پڑی سزا مل چکی تھی۔ اس کا والد سے ماں کی ملاقات کے بعد بہت سے راز افشا ہوئے تھے..... وہ بچہ کچھ دم ہی اچھے ہوئے دھماکے کی ساری گر جیسا لگتی تھی۔ وہ دیکھا لوں میں اتنا کن تھا کہ اسے اس کا حال آگے لے کر اس کا حال نہ

”ثروت..... تمہارے مہمان آئے ہیں۔“ اور
تب ہی اس کی نظریں پھسل کر زعیم کے پیچھے کھڑے
لوگ کے برجائی تھیں..... وہ ہوبہو گریز جیسا تھا۔
”آئی۔“ ثروت کو انتظار تو تھا، وہ پاؤں میں
چپل اڑس کر باہر آئی تھی۔ وہ سب آئے تھے۔
زعیم..... ارمان اور شبو۔

”ہم تجھے لینے آئیں ہیں باقی..... ارمان اور
اصباح کی مکنتی ہے، تیرے بغیر کیسے ہوتی مکنتی باقی وہ
مکان میں نے ارمان کے نام لکھ دیا ہے۔ شادی کے
بعد اصباح اور ارمان وہیں رہیں گے اور تو بھی وہیں
رہے گی اپنے بیٹے بہو کے ساتھ۔“ شبو نے بات
شروع کی تھی۔ دلشاد نے ثروت کی طرف دیکھا۔ اس
کی نظروں میں خوف تھا کچھ جتنا ہوا سا احساس تھا۔
دیکھ ثروت..... اکیلی تو میں رہ گئی..... دوستی اور
وفائے دھوکا تو مجھے دیا۔ وہ باہر نکل گئی۔ ثروت نے
اس کی نظروں میں بہت تسکین دیکھی تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے، میرے ساتھ دلشاد بھی ہے
اور پھر تو کہاں جائے گی شبو؟“

”ہاں تو دلشاد کو اکیلا تو نہیں چھوڑیں گے
یاں..... پہلے ارمان کی ماں اور نانی ساتھ رہتی
تھیں اب ماں اور ماسی رہیں گی۔“ شبو کی آنکھیں
بھرا گئیں۔ ثروت کے ساتھ ساتھ باہر کھڑی دلشاد کو
بھی شبو بہت اونچی مسند پر بیٹھی نظر آئی جہاں شاید کوئی
عورت یا مرد نہ پہنچ سکے۔

”میں اور کہاں جاؤں گی، وہیں جہاں سے آئی
تھی۔ ہم لوگ بے ٹھکانا ہو کر نہ جی سکتے ہیں باقی نہ رہ
سکتے ہیں۔ ہماری اپنی ہی دنیا ہوتی ہے۔ اس دنیا کے
اپنے اصول ہیں۔ اپنا جینا ہے اپنا مرنا ہے۔ سمجھ لے
کہ زندگی کے یہ کچھ سال مجھے حکم مجاوری ہوا اور میں
مجاور بن گئی۔ ایک درخواست ہے تیرے آگے، میں
ارمان کی ماں ہوں۔ اسے الگی پکڑ کر چلنا میں نے
سکھایا۔ کلمہ پڑھنا سکھایا۔ دودھ کی بوتل ہٹا کر گود میں
لوری سناتے دودھ پلایا۔ بس اس سے ملنے پر پابندی
نہ لگاتا باقی۔“ وہ ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ ثروت بڑھ

ہوا..... وہ بڑی خاموشی سے اس کے پاس آ بیٹھی۔
”آئی ایم سوری ارمان۔“ اس کی آواز پر
نظریں اس کے چہرے پر نکادیں جہاں شرمندگی اور
اس کی محبت کے ملے جلے آثار تھے۔
”تم یہاں کیسے آئی؟ کس کے ساتھ؟“
”آئی شبو کے ساتھ..... آئی میں تمہاری ماں
کے ساتھ۔“ وہ دیر سے مسکرائی تھی۔

”مجھے بہت دیر سے سمجھ میں آیا ارمان..... کہ
انسان کی پہچان اس کے جسم سے نہیں، اس کے دل
سے ہوتی ہے، اس کی نیت سے ہوتی ہے اور تمہاری
ماں بہت عظیم ہیں ارمان..... آئی شبو بہت گریٹ
ہیں۔“ وہ سر جھکائے بولی۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ماں اسی بڑی سی
جاور میں ملوث وہیں کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ زعیم
انگل بھی ساتھ تھے۔ وہ ثروت کے متعلق سب کچھ
انہیں بتا چکی تھیں۔

”ہم لوگ ثروت پھوپھو کو لینے جا رہے ہیں۔
بابا کہہ رہے تھے مکنتی کی رسم ان کے بغیر تو ہو نہیں سکتی۔
تمہاری اصل ماں تو وہی ہیں ناں ارمان.....“ اس
نے ارمان کے چہرے پر کچھ کھوجنا چاہا۔ وہ بانی کی
نیلا ہٹوں کو دیکھتا خاموشی سے اثبات میں سر ہلا گیا۔
”میں شاید نہ جاسکوں، دادی کی وجہ سے.....
مگر تم چلے جانا..... انہیں خوشی ہوگی کہ ان کا بیٹا انہیں
لینے آیا ہے۔“ وہ بات مکمل کر کے اس کی طرف دیکھتی
رہی۔ اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

سردی بڑھنے لگی تھی۔ ثروت رضائی میں دبکی
بیٹھی تھی۔ باہر بارش برس رہی تھی۔ دلشاد باورچی
خانے میں رات کی روٹیاں پکا رہی تھی جب دروازہ
بڑے زور سے بجھا۔

”الٹی خمر..... اس وقت کون آ گیا؟“ وہ چوہا
بند کرتی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولنے پر
جو چہرے اسے نظر آئے وہ اس کے لیے انہماں ہی
تھے ہاں زعیم صاحب کو اس نے پہچان لیا تھا۔

☆☆☆
(20 جون 2018ء)

بڑی روشن اور چمکیلی صبح تھی۔ رات ہی ارمان اور اصباح کی منگنی ہوئی تھی۔ وہ اور دلشاد ارمان والے مکان میں شفٹ ہو چکی تھیں۔ ارمان نے ان کا کام بھی بند کروا دیا تھا۔ اسے خود ایک اچھی جگہ جاب مل چکی تھی۔ اسی ہزار سیلری اور گاڑی کے ساتھ وہ ایک اچھی اور خوش گوار زندگی گزار سکتے تھے۔ شیو اور گرد واپس چلی گئی تھیں۔ ثروت اور زعمیم نے بے حد جھنجھکتے ہوئے دس لاکھ کی واپسی کی بات کی تھی تب شیو نے ہنس کر کہا تھا۔

”جو خوشی، ان پچیس سالوں میں مجھے وہ نیکی کما کر ہوئی جو ارمان کی صورت میری گود میں آئی تھی، اس کے سامنے دس لاکھ کیا ہیں۔ مجھے گناہ گار نہ کر باجی..... اور ہاں..... اگلے سال آؤں گی اپنی باجی سے ودھائی لینے تیری شیو بن کر اور مٹھائی لے کر آؤں گی دادی بن کر.....“ ایک طمانیت سی دل میں اتر رہی تھی۔

دلشاد جو ہر دکھ میں اس کے ساتھ تھی، آرام سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس کے آرام اور سکھ کو دیکھ کر ثروت کو خوشی مل رہی تھی۔ اب شاید سب کچھ ٹھیک تھا..... زندگی میں ”ایک محبت“ کے لیے وہ رل گئی تھی اور کئی مہینوں نے مل کر سب سنوار بھی دیا تھا۔

”جاؤ گل ریز..... تم جہاں بھی ہو..... میں نے تمہیں معاف کیا..... میرے ارمان نے تمہیں معاف کیا۔“ کھڑکی میں کھڑی دور آسمان کو دیکھتے ایک سکون بھری سانس لیتے ہوئے اس نے دل سے اسے معاف کیا تھا، اور وہاں چارپائی پر لیٹے گل ریز کا دم بڑی خاموشی سے نکل گیا تھا۔

رقیہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ شاید بس کسی کی بد دعا کے حصار میں تھا، بس ایک معافی کا منتظر۔

☆☆

کر بولی تھی۔
”یہ ہاتھ سر پر رکھنے کے لیے شیو..... تسلی دینے کے لیے..... دلا سادینے کے لیے..... رہ رہ بننے کے لیے..... مجھ سے زیادہ حیران ہے ارمان پر..... اتنی اچھی تربیت تو شاید میں بھی نہ کر سکتی۔“ وہ رونے لگی۔
زعمیم اور ارمان خاموشی سے دیکھتے رہے۔

”میں اور کرو شادی میں بھی شامل ہوں گے مگر اس کے بعد تمہارا اور دلشاد بہن کا وہاں رہنا ضروری ہے۔ اور ہمارے ساتھ تو نہیں رہ سکتی ناں۔ ایک بار تو نے اپنا بیٹا میرے حوالے کیا تھا، آج میں اپنا بیٹا تیرے حوالے کر کے جارہی ہوں باجی۔“ وہ سسکی تھی، ثروت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ایک شرط ہے میری..... اگر دلشاد مانی تو؟“
”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا ثروت..... بچپن سے لے کر اب تک میرے پاس رشتوں کے نام پر صرف تیری صورت میں ایک بہن ہی ہے اور تجھ سے بڑے سارے رشتے میرے ہیں..... اب تو میرا جینا مرنا وہاں ہی ہے جہاں تو ہے ثروت۔“ دلشاد نے اندر آ کر اس کی مشکل آسان کی تھی۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھری تھی۔
”تو پھر چلیں۔ کل شام کو میں ملازم کو بھیج کر سامان منگوا لوں گا، تم بھی ساتھ آ جانا۔“ زعمیم نے ثروت سے صلاح لی۔ ارمان آگے بڑھ کر ثروت سے لپٹ گیا تھا، اسے دیوانہ وار چومتے ہوئے اس نے زعمیم کی طرف دیکھتے اثبات میں سر ہلایا۔

”جو ہوا..... یہ زندگی میں ہونا تھا..... یہ مقدر تھا اور مقدر کا لکھا کوئی ہال نہیں سکا..... لیکن ایک بار..... ایک بار تم واپس آ کر مجھ سے بات تو کر تیں ثروت..... تو یہ سوچیں کہ تمہاری مقدر نہ بنتیں۔“ زعمیم صرف سوچ سکے۔ ہنا کچھ کہے مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”تو کج کہتی تھی شیو..... تو میرے راستے میں کھڑی تھی یا پھر میرا راستہ ہی تجھ تک تھا۔“ وہ اور دلشاد سامان سینے لگی تھیں۔